ندائے خلافت کے تین خصوصی شمارے

(۱) سقوط مشرقی پاکستان نمبر

☆ پاکستان کیسے ٹوٹا؟ پاکستان توڑنے کا ذمہ دار کون؟

☆ 7 دسمبر 1970ء سے 16 دسمبر 1971ء تک سانحہ مشرقی پاکستان کی تاریخ وار روداد

☆ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے سامنے گورنر ایڈمرل ایس ایم احسن کا بیان

☆ مجیب الرحمٰن کے قتل کی کہانی —— حسینہ واجد کی زبانی

یہ سب ندائے خلافت کے ''سقوط مشرقی پاکستان نمبر'' میں پڑھیے:

صفحات 68..... قیمت 20 روپے

☆☆☆

(۲) فلسطین نمبر

☆ تنازعہ فلسطین کا تاریخی پس منظر

☆ موجودہ سنگین صورت حال..... اور فلسطین کا مستقبل جیسے موضوعات پر مشتمل ایک دستاویز

96 صفحات..... قیمت: 35 روپے

☆☆☆

(۳) پیام اقبال بنام نوجوانان ملت

☆ سال اقبال کے حوالے سے علامہ اقبال کے حضور ہدیہ عقیدت

☆ اقبال کا انقلابی و آفاقی پیغام جس میں موجودہ حالات کے حوالے سے امت مسلمہ، مسلمانانِ پاکستان اور بالخصوص نوجوانوں کیلئے دعوت فکر و عمل ہے، پیام اقبال کا موضوع ہے

صفحات: 86..... قیمت 50 روپے

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور**

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 03-5869501

07 APR 2003

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا
(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی
معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)
ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | صفر المظفر ۱۴۲۴ھ - اپریل ۲۰۰۳ء | شمارہ ۴

— یکے از مطبوعات —
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱
کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۲۱۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے
☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

فیصلے کی گھڑی

عراق کے شہروں، خصوصاً بغداد پر امریکی اور برطانوی طیاروں کی ہولناک بمباری جاری ہے۔ ہزاروں بے گناہ شہری ہلاک و زخمی ہو چکے ہیں۔ روزانہ بے شمار عمارتیں ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوتی اور سینکڑوں کی تعداد میں عراقی عوام خون میں نہلائے جاتے ہیں۔ امریکہ کی اس غنڈہ گردی، ہٹ دھرمی اور ظالمانہ کارروائی پر ملتِ اسلامیہ کا ہر دردمند فرد تو خون کے آنسو روتا ہی ہے، پورا عالم انسانیت بھی بلاتفریق دین و مذہب سراپا احتجاج بن کر سڑکوں پر نکل آیا ہے لیکن امریکی صدر جارج ڈبلیو بش جو خود کو ''مامور من اللہ'' سمجھتا ہے، بہرصورت عراق پر قبضے کے دیرینہ خواب کی تکمیل چاہتا ہے۔ گریٹر اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کرنا وہ اپنا دینی و مذہبی فریضہ گردانتا ہے۔ امریکہ کو خلاف توقع عراق میں شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ اس کا اچھا خاصا جانی و مالی نقصان ہو چکا ہے اور امریکہ کو بادلِ نخواستہ یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ یہ جنگ خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ مغربی پریس رمزفیلڈ کے جنگی پلان کو شدید طور پر تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اخباری ذرائع کے مطابق خلیج میں موجود امریکی و اتحادی فوجیوں کے حوصلے پست نظر آتے ہیں ـــــ دوسری جانب نہ صرف یہ کہ صدام حسین امریکہ کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوا ہے بلکہ عراقی عوام بھی بے پناہ جرات و حوصلے کے ساتھ امریکی وحشیانہ جارحیت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پورے عالم عرب سے جوشیلے اور جذبہ جہاد رکھنے والے نوجوان بھی کھنچ کر عراق پہنچ رہے ہیں ـــــ امریکہ نے عراق کے خلاف حالیہ جنگ کی عمارت اپنی اخلاقی شکست کے ملبے پر اٹھائی ہے ـــــ اس نے پورے عالم اسلام کو اپنا مخالف تو بنا ہی لیا ہے، عالم عیسائیت کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ بش نے بہت بڑا جوا کھیلا ہے۔ اس کی ناکامی امریکہ کو معاشی و اخلاقی موت سے دوچار کر سکتی ہے۔

صدام حسین اور عراقی عوام کی جانب سے غیر معمولی مزاحمت جہاں امت مسلمہ کے لئے نیک شگون کا درجہ رکھتی ہے، وہیں خوفناک اندیشوں کا ایک سیلاب بھی اس کے جلو میں موجزن نظر آتا ہے۔ یہ صورتِ حال امریکی صدر کی جھنجھلاہٹ اور اشتعال میں مزید اضافے کا موجب بن سکتی ہے۔ اپنے ناپاک عزائم کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ اور مزاحمت کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے لئے امریکہ بڑے سے بڑا قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ خود کو عراقی عوام کے مسیحا کے طور پر پیش کرنے والا جارج بش ہلاکو خان بن کر کیمیائی یا ایٹم بم کے ذریعے عراقی عوام کا نام و نشان مٹانے سے بھی باز نہیں رہے گا، اعاذنا اللہ من ذٰلک۔ (باقی صفحہ ۱۴ پر)

درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۲)

اقتدار و اختیار اللہ کا

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''اسی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی' وہ زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

آیت کے آغاز میں جو حرفِ جار ''ل'' آیا ہے یہ عربی میں بہت سے معنوں میں آتا ہے' لیکن ایسے مقامات پر یہ اکثر و بیشتر دو معنوں کا حامل ہوتا ہے۔ یہ لام تملیک کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور استحقاق کے لئے بھی۔ تملیک کا مفہوم ہے ''کسی شے کا مالک ہونا'' جیسے هٰذَا الْقَلَمُ لِيْ ''یہ قلم میرا ہے'' یعنی میں اس کا مالک ہوں' یہ میری ملکیت ہے۔ اور استحقاق یہ ہے کہ کسی کو اس کا حق پہنچتا ہو۔ اسی کو آپ انگریزی میں کہتے ہیں: de facto & de jure۔ چنانچہ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا مفہوم ہوگا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور بادشاہی de facto بھی اسی کی ہے اور de jure بھی اسی کی ہے۔ اسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ لفظ ''مـــلـک'' بھی دونوں معنی دیتا ہے۔ ''م ل ک'' ہی سے ملکیت اور مالک ہے' اور اسی سے مُلک ہے' یعنی حکومت' بادشاہی۔ اسی لئے سورۃ الفاتحہ کی قراءت میں بھی ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' اور ''مَـلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' دونوں قراءتیں موجود ہیں۔ ''مَلِک'' بادشاہ ہے اور ''مَالِک'' کسی شے کی ملکیت کا حق رکھنے والا۔ اور دونوں میں منطقی ربط یہی ہے کہ جو کسی شے کا مالک ہے اسی کو اختیار حاصل ہے کہ اسی کی مرضی کے مطابق اس میں تصرف ہو۔ اس پہلو سے اللہ کی بادشاہی ''مُلک یا ملوکیت'' اور اللہ کی ملکیت دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔ اور ''لَہٗ'' میں یہ دونوں پہلو ہیں۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا شرک

میں اپنے ''خطباتِ خلافت'' اور دیگر خطابات میں یہ بات بڑی تفصیل سے واضح کر چکا ہوں کہ غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے۔ بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے۔ اور اسی کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے اس طرح کی ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری!

چاہے وہ فرد واحد ہو' جو فرعون یا نمرود بن گیا ہو اور چاہے وہ حاکمیت جمہور کا تصور ہو۔ یہ بات سمجھانے کے لئے میں نے بارہا یہ تمثیل دی ہے کہ گندگی کی کوئی بہت بڑی پوٹ خواہ ایک شخص کے سر پر رکھی ہو اور خواہ اسے تولہ تولہ' ماشہ ماشہ تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے' گندگی تو گندگی رہے گی۔ فرعونیت اور نمرودیت یہ تھی کہ ایک فرد اقتدارِ اعلیٰ کا مدعی تھا۔ فرعون نے کہا تھا: ﴿اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ﴾ (الزخرف: ۵۱) ''کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟'' یعنی یہ آب پاشی اور آب رسانی کا سارا نظام میرے اختیار میں ہے' جس کو چاہوں پانی دوں' جس کا چاہوں موگہ بند کر دوں۔ یہ تھا فرعون کا دعویٰ جس کو قرآن مجید نے تعبیر کیا کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی﴾ ــــ لیکن یہی معاملہ آج یہ صورت اختیار کر چکا ہے کہ خدائی کا دعویٰ تقسیم ہو گیا ہے' اسے تمام

لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نظری اعتبار سے سب حاکم ہیں۔ عوام کی حاکمیت (Popular Sovereignty) ہے' لیکن جان لیجئے کہ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمین کی حاکمیت کا حق' حکومت کا حق صرف اُسی کو حاصل ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔

انسانی اختیار کی اصل حقیقت

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تھوڑا سا اختیار دیا ہے اور وہ اسی کے بل بوتے پر حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے' حالانکہ اگر آپ حقیقت کے اعتبار سے غور کریں تو معاملہ بالکل وہی نظر آتا ہے جس کو محاورے میں کہا جاتا ہے کہ چوہے کو ہلدی کی گانٹھ مل گئی تھی اور وہ پنساری بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کیا حکومت ہے انسان کی! اپنے وجود پر تو اس کا اختیار چل نہیں رہا۔ اس کے اپنے جسم کا پورا نظام اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اگر چاہے کہ میرے جسم کے فلاں حصے پر بال نہیں اگنے چاہئیں تو اسے اس کا بھی اختیار نہیں۔ وہ تو اگیں گے' آپ ان کو روک نہیں سکتے۔ آپ کی انتڑیوں کے اندر حرکت آپ کے اختیار میں نہیں ہے' وہ تو کوئی اور ہی قانون ہے' کسی اور ہی کی مرضی ہے جس کے تحت ان میں حرکت ہوگی۔ آپ کا دل آپ کے اختیار میں نہیں ہے' جب بند ہو جائے گا تو پھر آپ کی مرضی سے دھڑکنے والا نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا اپنا پورا وجود اسی قانونِ خداوندی کے اندر جکڑا ہوا ہے۔ اذنِ ربّ کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ ہمارے اپنے وجود کے اندر بھی پورا کا پورا نظام اسی قانون کے شکنجے میں ہے۔ لیکن اللہ نے بس ایک اختیار دے رکھا ہے: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ یعنی چاہو تو شکرگزاری کی راہ اختیار کرو اور چاہو تو ناشکری کی روش اختیار کرو۔ یہ اسی کی دی ہوئی آزادی ہے' لیکن ہم نے ہلدی کی اس گانٹھ کے برتے پر اپنی بادشاہی کا تخت جمایا ہے۔

ملحدین کے تصورِ موت وحیات کی تردید

آگے فرمایا: ﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ ''وہ زندہ رکھتا ہے اور مارتا ہے۔'' نوٹ کیجئے کہ زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے' اگر میں یہ کہتا ہوں ''ہم مرتے ہیں' ہم جیتے

ہیں۔'' گویا کہ موت اور زندگی کی نسبت ہم اپنی طرف کر رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ مجوبیت ہے' یعنی ہم پردے میں آ گئے' اوٹ میں آ گئے' اور یہی گمراہی ہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہ جب چاہے گا ہم پر موت وارد کر دے گا۔ یہ کمالِ معرفت ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے ''مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد'' اسی طرح ہدایت میں اور ضلالت میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ''اللہ جلاتا ہے' اللہ مارتا ہے اور ''ہم جیتے ہیں' ہم مرتے ہیں''۔ چنانچہ قرآن مجید میں کفار و مشرکین کا ایک قول نقل ہوا ہے' جسے ہم کہیں گے کہ یہ آج کے مادہ پرست ملحد انسان کا موقف ہے۔ فرمایا: ﴿وَقَالُوْا مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیۃ: ۲۴) ''اور انہوں نے کہا زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے' ہم خود ہی جیتے اور خود ہی مرتے ہیں اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ''۔ یہاں ''نَمُوْتُ وَنَحْيَا'' میں نسبت اپنی طرف ہے کہ ہم جیتے ہیں' ہم مرتے ہیں۔ اگر نسبت بدل کر یہ کہا جائے کہ ﴿يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ﴾ ''وہی زندہ کرتا ہے (یا زندہ رکھتا ہے) اور وہی موت وارد کرتا ہے'' تو اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف ہو گئی اور یہی ہدایت ہے' یہی معرفت ہے' یہی توحید ہے۔

آیت کے آخر پر فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ''اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔''

مؤمن کا مطلوب و مقصود۔ معرفتِ ربّ

میں نے عرض کیا تھا کہ معرفت الٰہی ہی درحقیقت انسان کی سب سے زیادہ مطلوب و مقصود شے ہونی چاہئے' اس لئے کہ جتنی معرفت ہو گی اتنا ہی درحقیقت ہمارا عملی رویہ بھی درست ہو گا۔ جتنا اللہ کی عظمت کا انکشاف ہو جائے گا' اتنی ہی ہمارے اندر اللہ کے سامنے فروتنی اور سرافگندی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؏ ان کا غرور دیکھ کر بن گئے خاکسار ہم! یہاں لفظ ''غرور'' تو مناسب نہیں ''ان کا عروج دیکھ کر'' کہہ لیجئے۔ جتنا اللہ کی عظمت کا انکشاف ہو گا اتنا ہی انسان کے اندر تواضع' فروتنی اور گردن جھکا دینے کی کیفیت پیدا ہو گی۔ اس اعتبار سے اصل شے جو

مطلوب و مقصود کے درجے میں ہے وہ معرفت ربّ ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں بہت سے مفسرین اور صوفیاء نے ''عبادتِ ربّ'' اور ''معرفتِ ربّ'' کو مترادف قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ کی جو تفسیر کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْرِفُوْنِ'' یعنی ''میں نے نہیں پیدا کیا ہے انسانوں کو اور جنوں کو مگر اس لئے کہ میری معرفت حاصل کریں''۔ اس لئے کہ معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کا منطقی نتیجہ عبادت کی صورت میں نکلے گا۔ اگر کسی شخص کو اللہ کے حسن و جمال کی کوئی جھلک کبھی نصیب ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی اور کے حسن کا گرویدہ ہو! کسی اور کی محبت اس کے دل میں کیسے گھر کرے گی! ابن سینا کا ایک بڑا پیارا جملہ ہے ''اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات میں سے تمہیں کوئی حصہ ملے تو تمہیں اپنی خلوتوں میں ریاضت کرنی پڑے گی' توجہ کرنی ہو گی' لو لگانی ہو گی' مراقبے کرنے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کبھی کوئی کرن تمہیں بھی نصیب ہو جائے''۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کو کبھی حقیقی معرفتِ ربّ کی کوئی چمک اور اس کی کوئی جھلک اگر مل جائے تو پھر اس کے لئے کسی اور سے دل لگانے اور کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ تو اس معنی میں ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ اور ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْرِفُوْنِ'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ معرفت حقیقی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ آپ اسی کی محبت میں گرفتار ہیں' اسی کی رضا جوئی میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیں گے' اسی کی یاد سے آپ کے دل کو راحت اور سکون و اطمینان نصیب ہو گا ﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ضمن میں اب ایک بات اور نوٹ کیجئے۔ معرفتِ ربّ کو دو حصوں میں تقسیم کیجئے۔ ایک معرفت ذات اور ایک معرفت صفات۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کوئی تصور کسی انسان کے لئے قطعاً ممکن نہیں۔ یہ ہمارے لئے out of bounds ہے۔ اس پر سے پردہ آخرت میں اٹھے گا۔ چنانچہ آخری نعمت جو اہل جنت کو نصیب ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا۔ گویا حور و قصور اور جنت کی جتنی نعمتوں کا بھی تذکرہ ہے

ان سب سے کہیں بڑھ کر اور آخری شے جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ بہرحال معرفت ذات ہمارے لئے ناممکن ہے' ہم اُس کی ذات کی کنہہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس ضمن میں ایک بات کہی تھی' اور وہ چونکہ شعریت میں ڈھلا ہوا جملہ تھا' لہٰذا اس پر حضرت علی ؓ نے گرہ لگا کر شعر بنا دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے [العجز عن درک الذات ادراک] یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانے کا جب انسان کو احساس ہو جائے تو یہی ادراک ہے۔ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد! یہی درحقیقت علم ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کی ذات کا کوئی تصور' کوئی تخیل اور کوئی فہم ہمارے لئے ممکن نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے مذکورہ بالا قول پر حضرت علیؓ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: [والبحث عن کنہ الذات اشراک] یعنی اللہ کی ذات میں اگر کھوج کرید کرو گے تو کہیں نہ کہیں شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لئے کہ جب کھوج کرید کرو گے تو جو تمہارا اپنا ذہنی تصور ہے اس کا کوئی نہ کوئی ہیولا قائم کرو گے' اور وہ اللہ تو نہیں ہے' اللہ تو تمہارے تصور سے ماوراء ہے' تم نے کوئی تصور قائم کیا تو تم نے گویا خود اپنا ایک خدا بنا لیا' اور یہی تو شرک ہے۔ ایک بُت تراش نے جو بُت بنایا ہے تو اپنے خیال میں تو خدا بنایا ہے' مگر بُت کو وہ اپنے خیال کے مطابق ایک انسانی صورت دے رہا ہے۔ اس پر بُت اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

مرا بر صورتِ خویش آفریدی برونِ خویشتن آخر چہ دیدی؟

یعنی تُو نے تو ایک خدا بنانا چاہا تھا' لیکن تو نے اپنی ہی شکل میں مجھے بھی ڈھال دیا۔ تیرے دو ہاتھ تھے' میرے بھی دو ہاتھ بنا دیئے' تیرے دو پاؤں تھے' تو نے میرے بھی دو پاؤں بنا دیئے' تیری دو آنکھیں تھیں' تو نے میری بھی دو آنکھیں بنا دیں۔ تو نے اپنے سے باہر بھی کچھ دیکھا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ اعتراف کہ وہ ہماری رسائی سے ماوراء' وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے' یہی علم اور معرفت ہے۔ خاص طور پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جو مکاتیب یعنی

خطوط ہیں ان مکتوبات شریفہ میں یہ الفاظ بار بار آتے ہیں۔ اس لئے کہ واقعتاً تصوف کے وہ گوشے جو اس کھوج کرید کی طرف لے جاتے ہیں' وہ گمراہی اور شرک کی طرف لے جاتے ہیں' جبکہ والبحث عن کنه الذات اشراک۔

اب رہ گیا ہمارے پاس صرف ایک معاملہ کہ ہم اللہ کو صرف اس کے اسماء و صفات کے حوالے سے پہچان سکتے ہیں۔ اسماء بھی درحقیقت اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ یہ بحث ہم سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں کیا کرتے ہیں کہ ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ''اللہ'' ہے اور باقی تمام کے تمام اسماء صفاتی ہیں۔ رحیمٌ صفت ہے' جبکہ الرحیم اس کا ایک نام بن گیا۔ اسی طرح علیمٌ صفت ہے' العلیم اس کا نام ہو گیا۔ قادرٌ صفت ہے اور القادر اس کا نام ہو گیا۔ چنانچہ تمام اسماء حسنیٰ صفاتی نام ہیں' بلکہ میری رائے میں تو ان حضرات کے ساتھ ہے جو ''اللہ'' کو بھی صفاتی نام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اِلٰہٌ سے ''الالٰہ'' اور اس سے ''اللہ'' بنا ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے تمام کے تمام اسماء صفاتی ہیں۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جو بھی خزانہ ہے یا اس کا جو بھی ذریعہ ہے وہ صرف اسماء و صفات ہیں۔ چنانچہ ایمان مجمل کے الفاظ یاد کیجئے: آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ ''میں ایمان لایا اللہ پر (میں نے مانا اللہ کو) جیسا کہ وہ اپنے اسماء و صفات سے ظاہر ہے''۔ یہی ایمان باللہ ہے۔ باقی اُس کی ذات سے کوئی بحث نہیں۔

صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت و کمیت؟

اب تیسرے درجے میں ایک بات اور ہے۔ اللہ کی صفات کی بھی ہم نہ تو کمیت کو جانتے ہیں نہ کیفیت کو۔ یہ ہمارے علم اور فہم کی محدودیت ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ قادر ہے —— لیکن کتنا قادر ہے؟ ہمارے ذہن کے اندر اس کا کوئی تصور نہیں آ سکتا' اس لئے کہ سنار کی ترازو ماشے تولے ہی تول سکتی ہے' ٹنوں کا وزن نہیں تول سکتی۔ چنانچہ اللہ کی قدرتِ مطلق کا ہمارا ذہن کیا تصور کر سکتا ہے؟ اسی طرح ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ''البصیر'' ہے' دیکھنے والا ہے' وہ ''السمیع'' ہے' سننے والا ہے۔ لیکن وہ کیسے

سنتا ہے' یہ ہم نہیں جانتے۔ کیا اس کے کوئی کان ہیں؟ معاذ اللہ! کیا وہ ہماری طرح sound waves کا محتاج ہے کہ waves آ کر کان کے پردے سے ٹکرائیں تو کچھ سنائی دے گا؟ معاذ اللہ! تو وہ کیسے سنتا ہے؟ دیکھنے کے لئے کیا وہ کسی روشنی کا محتاج ہے کہ اس کے ذریعے آنکھ کے پردے (retina) کے اوپر جا کر عکس بنتا ہے؟ معاذ اللہ! تو وہ کیسے دیکھتا ہے؟ نہ ہم کیفیت جان سکتے ہیں' اس لئے کہ وہ تو ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ وہ علیم ہے تو کتنا علیم ہے؟ کتنا علم ہے اس کا؟ ہم کیسے ناپیں گے' کیسے تولیں گے؟ پھر وہی بات کہوں گا کہ سنار والی ترازو پر یہ ٹنوں وزن کیسے تولا جائے گا! اس حوالے سے یہ ہماری درماندگی ہے۔ قرآن کریم ہماری اس درماندگی کا علاج لفظ ''کُل'' سے کرتا ہے۔ ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی لفظ ہے ہی نہیں کہ ''وہ ہر شے پر قادر ہے''۔ اور آگے چل کر آئے گا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ''وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔ بس ''ہر'' کے لفظ میں یا ''کُل'' کے لفظ میں پناہ لینے کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ نہ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کتنی ہے' نہ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ اس کی قدرت کی کیا کیفیت ہے۔ اس کا علم کتنا ہے؟ ہم نہیں جان سکتے۔ اس کے علم کی نوعیت کیا ہے؟ معاذ اللہ' ہم کیا جانیں۔

زیر مطالعہ آیت کے اختتام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اور اس سے اگلی آیت ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ اور ان دو صفات (علم اور قدرت) کو یوں کہنا چاہئے کہ یہ ''اُمّ الصفات'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء صفت علم ہی سے متعلق ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ خبیر ہے' سمیع ہے' بصیر ہے۔ اور یہ سب علم ہی کے تو شعبے ہیں۔ اسی طرح القابض' الباسط' الرافع' الخافض' یہ سب درحقیقت ''وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہی کی تو شرح ہیں۔ بس ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی شے کے بارے میں اگر ہمارے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ اللہ یہ کیسے کرے گا؟ تو معلوم ہوا کہ ''وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ اس کی قدرت تو مطلق ہے' boundless اور limitless ہے۔ کوئی شے

اس کے لئے مشکل نہیں۔ اسی طرح ہر شے اس کے علم میں ہے۔ اور صفت علم کو تو آپ دیکھیں گے کہ اگلی آیات میں کیسے دہرا دہرا کر لایا گیا ہے: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۞﴾ یہ وہی اس کی صفت علم ہی تو چلی آ رہی ہے اور ﴿وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ میں بھی اسی صفت علم ہی کا تو تذکرہ ہو رہا ہے۔

انہی دو صفات (علم اور قدرت) کے حوالے سے جان لیجئے کہ ایمانیات میں تقدیر پر ایمان ((وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ)) درحقیقت انہی دونوں صفات پر ایمان کا منطقی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اب اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اس پیالے کو اللہ کے اذن کے بغیر اٹھا سکتا ہوں تو گویا میں نے اپنی قدرت کو اللہ کی قدرت کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا اور یہی شرک ہو جائے گا۔ میں نے ارادہ ضرور کیا ہے کہ اس پیالے کو اٹھا لوں' لیکن جب تک اذنِ ربّ نہ ہو' اس کی توفیق اور اس کی تیسیر نہ ہو' میں اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ گویا کہ اللہ کی قدرت تمام قدرتوں کے اوپر محیط ہے' حاوی ہے' ان کے اوپر مستولی ہے' چھائی ہوئی ہے۔ اسی طرح کل مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ عالم ما کان و ما یکون ہے۔ ہر شے اس کے علم میں ہے۔ اس کے لئے ماضی' حال' مستقبل ہے ہی نہیں۔ یہ زمانے تو ہمارے لئے ہیں' اس کا علم تو بسیط ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چونکہ جو کچھ میں کل کرنے والا ہوں وہ اللہ کے علم میں ہے' لہٰذا میں مجبور ہوں کہ وہ کروں۔ یہ جبر و قدر کی بحث ہے' اس کو علیحدہ کر لیجئے۔ یہ اُس کا Pre-Knowledge ہے' جو Pre-Determination کو مستلزم نہیں ہے۔ اللہ ہر شے کو جانتا ہے اور ہمیشہ سے جانتا ہے۔ ہر شے جو ہونے والی ہے وہ اُس کے علم کامل کے اندر ازل سے موجود ہے' لیکن اس کے معنی جبر کے نہیں ہیں' لہٰذا Pre-Determination کو Pre-Knowledge سے علیحدہ کر لیجئے۔ عام طور پر ذہنوں کے اندر جو اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو لازم و ملزوم سمجھ لیا جاتا ہے۔

تیسری آیت ـــــ مشکل ترین مقام

سورۃ الحدید کی تیسری آیت قرآن حکیم کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔ ذات وصفات باری تعالیٰ کی بحث یہاں اعلیٰ ترین علمی سطح پر آئی ہے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝﴾

''وہی ہے اوّل (پہلا) اور وہی ہے آخر (پچھلا)' وہی ہے ظاہر (انتہائی نمایاں بھی اور غالب بھی) اور وہی ہے باطن (انتہائی مخفی اور چھپا ہوا)۔''

یہ آیت مبارکہ ہے جس کے بارے میں امام رازی کی پوری بحث کا تفصیل سے مطالعہ کیا جائے تو واقعتاً محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس آیت کی عظمت کے سامنے کھڑے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ اور انہوں نے الفاظ بھی ایسے پیارے لکھے ہیں: ''اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَام مقامٌ غامضٌ عميقٌ مهيبٌ''۔ یعنی ''جان لو کہ یہ مقام بڑا غامض ہے' عمیق ہے' مہیب ہے''۔ اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اس آیت کے مفہوم و معنی پر تو ان شاء اللہ اگلی نشست میں بحث ہوگی۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ اس سے متعلق چند بنیادی باتیں آپ ذہن نشین کر لیں۔ یہ درحقیقت فلسفۂ وجود سے متعلق آیت ہے اور فلسفے کا سب سے مشکل مسئلہ ماہیّتِ وجود ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ماہیّتِ زمان اور ماہیّتِ وجود' یہی فلسفے کے دو ایسے مسئلے ہیں جو لاینحل ہیں اور مشکل ترین ہیں اور چونکہ بہت سے حضرات کو اس کا ذوق نہیں ہوتا لہٰذا وہ اس موضوع پر گفتگو کو بھی وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ الفاظ قرآن میں آئے ہیں' لہٰذا ان پر غور و فکر ضروری ہے۔ قرآن مجید صرف عوام کے لئے ہدایت نہیں ہے' خواص کو بھی تو ہدایت یہیں سے ملے گی اور جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقل ودیعت ہوئی ہے وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کائنات کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وجود کی حقیقت کیا ہے؟ وجود کی ماہیّت کیا ہے؟ یہ سوالات ہیں جن پر انسان غور کرتا چلا آ رہا ہے' اور اس بارے میں مختلف آراء بنی ہیں' مختلف فلسفے وجود میں آئے ہیں' جن میں وحدت الشہود بھی ہیں' وحدت الوجود بھی ہے' پھر ثنویت بھی ہے اور تثلیث بھی ہے۔ اس پر تو بعد میں گفتگو ہوگی' اس وقت جو بات میں نوٹ کرانا چاہتا ہوں وہ صرف ظاہری الفاظ کے حوالے سے ہے۔

تین امتیازی فرق

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء عام طور پر جوڑوں کی شکل میں آتے ہیں۔ جیسے وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔اس ضمن میں صرف تین استثناءات ہیں اور وہ تینوں انہی سورتوں میں ہیں۔ یہاں چار اسماء اکٹھے آ رہے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ ۔ اسی طرح سورۃ الجمعہ کی پہلی آیت میں بھی چار اسماء اکٹھے آئے ہیں: ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ ۔تیسرا استثناء سورۃ الحشر کی آخری تین آیات ہیں' جن میں سے درمیانی آیت تو یوں سمجھئے کہ قرآن مجید میں اسماء باری تعالیٰ کا عظیم ترین اور حسین ترین گلدستہ ہے: ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ یہاں آٹھ اسماء تسلسل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔

دوسرا فرق یہ نوٹ کیجئے کہ عام طور پر اسماء باری تعالیٰ آیات کے آخر میں آتے ہیں' لیکن یہاں آیت کی اصل جو main body ہے وہ درحقیقت انہی اسماء پر مشتمل ہے۔اس کی کوئی اور مثال قرآن مجید میں نہیں ہے۔

تیسرا فرق جو اہم ترین ہے' یہ نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید میں اس ایک مقام کے سوا کہیں بھی اسماءِ باری تعالیٰ کے درمیان حرف عطف نہیں آیا۔ سورۃ الحشر کی مذکورہ بالا آیت میں آٹھ اسماءِ حسنیٰ آئے ہیں لیکن درمیان میں کہیں حرفِ عطف نہیں ہے' کوئی فصل نہیں ہے' ''اَلْمَلِكُ وَالْقُدُّوْسُ'' نہیں ہے۔قرآن مجید میں ہر جگہ ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' ہی آیا ہے' کہیں ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ وَالْحَكِيْمُ'' نہیں آیا۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے بڑی پیاری بات کہی ہے۔ جیسے کہ میں نے ایک بات عرض کی تھی کہ اللہ کے تمام اسماء وصفات مطلق ہیں' کوئی کسی کا تابع نہیں' ایسے ہی دوسری بات نوٹ کر لیجئے جو مولانا فراہیؒ نے لکھی ہے کہ اللہ کی تمام صفات اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں' جبکہ واؤ باہم فصل کر دیتا ہے' واؤ سے تو مغائرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ عطف جو ہے وہ معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت کا

سبب بنتا ہے۔ اور دنیا میں ہم یہ جانتے ہیں کہ صفات عموماً جمع نہیں ہوتیں۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں منتقم اور غفور تو نہیں ہوسکتا۔ یہ کیفیات تو مختلف ہوں گی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں یہ تمام شانیں بیک وقت بتمام وکمال موجود ہیں۔ اسی لئے کہیں فصل نہیں ہے' کہیں حرفِ عطف نہیں لایا گیا' سوائے اس مقام کے۔

اسماء باری تعالیٰ کے ضمن میں یہ تین امتیازی فرق ہیں جو اس آیت مبارکہ میں بقیہ تمام قرآن مجید سے ہیں' ان کو نوٹ کر لیجئے۔ باقی اس آیت مبارکہ پر مفصل گفتگو اِن شاء اللہ اگلی نشست میں ہوگی!

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

بقیہ: حرفِ اوّل

اللہ کی طرف سے اگر کوئی خصوصی معاملہ نہ ہوا تو پورے عراق پر امریکی قبضہ تقدیر مبرم کا درجہ رکھتا ہے۔ امریکہ کو اپنی حتمی کامیابی کا یقین کامل حاصل ہے ـــــ عراق کی شکست کو یقینی جانتے ہوئے اس نے اپنے اگلے ہدف کی جانب پیش قدمی کا آغاز کر دیا ہے' گو یہ ابھی بیانات تک محدود ہے لیکن حالات کے رخ کو دیکھ کر آنے والے وقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مختلف بہانوں سے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرانے بلکہ فرد قرارداد جرم عائد کرنے کا آغاز ہو چکا ہے۔ پاکستان پر الزام ہے کہ اس نے شمالی کوریا کو ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل کی ہے اور اس جرم کی پاداش میں پہلے قدم کے طور پر کہوٹہ لیبارٹریز پر پابندی کا فیصلہ سنایا جا چکا ہے ـــ پاکستان کے خلاف امریکہ کے اس یکطرفہ اقدام کے ردعمل میں پورے ملک میں امریکی تسلط کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ ملک کے اکثر طبقات بجا طور پر پُرزور انداز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ اس امریکی دھونس کے جواب میں امریکہ کے ساتھ تعاون کے خاتمے کا اعلان کرے' امریکہ کو فراہم کئے گئے اڈوں کو خالی کروائے اور ایف بی آئی کے اہلکاروں کو ملک سے بے دخل کرے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ ہم نے ''عالم اسلام کے خاتمے'' کی امریکی مہم میں امریکہ کے اتحادی بن کر جو شرمناک کردار ادا کیا ہے اس کا سلسلہ اب ختم ہونا چاہئے۔ ہمیں پوری امت کا ساتھ دیتے ہوئے کھل کر امریکی جارحیت کی مذمت کرنی چاہئے اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی بجائے مسلم اُمہ کو ساتھ ملاتے ہوئے پوری جرأت وہمت کے ساتھ امریکی عزائم کے مقابل چٹان بن کر کھڑے ہو جانا چاہئے۔ بصورتِ دیگر بھیڑ بکری بن کر ہمیں اپنی باری کا انتظار کرنا ہوگا اور امریکی جلاد کی چھری سے ہمیں بچانے والا کوئی نہ ہوگا ـــ ایک بات یاد رہے کہ امریکہ جیسے پاگل ہاتھی سے لڑائی مول لینے کے ساتھ اگر ہم بحیثیت قوم اللہ کا دامنِ رحمت تھام لیں تو دنیا کی واحد سپر پاور کے مقابلے میں کائنات کی واحد سپریم پاور ہمارے لئے کافی ہو جائے گی۔ (اللھم وفقنا لھذا) ورنہ اندیشہ ہے کہ ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں! oo

تدبیرِ عالم

سید وصی مظہر ندوی

ہمارا مشاہدہ ہے کہ سورج کی حرارت کے اثر سے سمندر کا پانی بھاپ بن جاتا ہے۔ بھاپ ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر جا کر بادل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بادل ہواؤں کے دوش پر تیرتا ہے۔ جب یہ ہوائیں کسی پہاڑ سے ٹکرا کر بلند ہوتی ہیں تو بادل بھی بلند ہو کر ٹھنڈے خطے میں پہنچ جاتا ہے اور پانی بن کر زمین پر برستا ہے یا پہاڑوں پر برف بن کر برستا ہے۔ برف کا یہ ذخیرہ پگھل کر پہاڑوں کی تازہ مٹی کے ساتھ میدانوں میں بہتے ہوئے دریاؤں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دریاؤں کا سیلاب میدانوں میں تازہ مٹی بچھا دیتا ہے۔ اوپر سے بارش زمین کا کھار اپنے ساتھ بہا کر دریا میں پہنچا دیتی ہے اور دریا بالآخر سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس طرح سمندر کے کھارے پن میں جبکہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انسانوں اور حیوانات کی غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہ تو کائنات کے صرف ایک چکر کا حال ہے جس کی بہت سی تفصیلات بھی ہم نے اختصار کی غرض سے بیان نہیں کیں۔

اسی طرح کا ایک چکر وہ ہے جس کے تحت زمین ایک طرف کو جھکی جھکی خود اپنے محور پر گھومتی ہوئی ۲۴ گھنٹے میں اپنا ایک چکر مکمل کر لیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ زمین بیضوی شکل میں سورج کے گرد ایک لمبا چکر بھی لگاتی ہے مگر یہ ۳۶۳ سے زائد دنوں میں مکمل ہوتا ہے۔ پہلی گردش سے دن رات کی آمد و شد ہوتی ہے اور دوسری گردش سے موسم تبدیل ہوتے ہیں، سردی، گرمی، خزاں اور بہار نمودار ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہم اسی طرح کے بے شمار چکروں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً بیج سے درخت، درخت سے بیج، انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈا وغیرہ۔

مگر ان بڑے بڑے چکروں کو ایک طرف رکھئے' ذرا ایک ''چھوٹے میاں'' کا کارنامہ تو دیکھئے۔ ان حضرت کو ذرّہ (ایٹم) کہتے ہیں۔ چھوٹے اتنے کہ ہم اپنی آنکھ سے ان کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ مگر اتنے چھوٹے ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک پورا جہاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ''مرکزہ'' (جسے دل کہہ لیجئے) ہوتا ہے اور اس مرکزے کے گرد کچھ برق پارے تیزی سے گھومتے ہیں۔ ہر عنصر میں برق پاروں کی تعداد جدا جدا ہے۔ یہ برق پارے بھاگنا چاہتے ہیں مگر ''مرکزہ'' (دل) بھلا کب انہیں بھاگنے دیتا ہے۔ ہاں! ایٹم بم اسی طرح سے تو بنتا ہے۔ بس مرکزے کی گرفت سے اس کے گرد گھومنے والے برق پارے آزاد ہو جاتے ہیں اور تباہی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

پھر ہمارے اپنے جسم میں کتنے چکر ہیں۔ غذاؤں کے جزوِ بدن بننے کا چکر' دورانِ خون کا چکر' حواسِ خمسہ کی معلومات کو دماغ تک پہنچانے اور دماغ کی ہدایات کو مختلف اعضاء تک پہنچانے والے وہ تارِ برقی جو پورے جسم میں بچھے ہوئے ہیں' ان میں سے ہر عمل ایک نہایت دقیق چکر ہے۔

ان تمام چکروں کو جب ہمارے علوم طبیعی کے ماہرین اور سائنس دانوں نے دیکھا جو یورپ کے جاہل پادریوں کی ضد میں کسی ''مدبّر عالم'' کو نہ ماننے کا فیصلہ پہلے سے کر چکے تھے تو ان کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ چنانچہ وہ سوچ سوچ کر یہ دور کی کوڑی لائے کہ ہم لوگ یہ جو مادّہ دیکھ رہے ہیں نا! اس مادّے کے اندر بہت مدت قبل ایک دفعہ ایک زوردار دھماکہ ہوا تھا۔ ہوا کیسے' یہ تو پتہ نہیں' مگر اس کے نتیجے میں اس بے جان مادّے میں یہ چکر شروع ہو گئے۔ اور ایک چکر کے دندانوں میں پھنس کر دوسرا چکر' دوسرے سے تیسرا اور اسی طرح یہ چکر لامتناہی صورت اختیار کر گئے۔ جیسے گھڑی کی ایک معمولی حرکت سے اس کا ایک پرزہ دوسرے پرزے کی حرکت سے حرکت کرنے لگتا ہے۔

اب سائنس دانوں کا یہ نظریہ ہے تو نظریہ ہی' کسی لیبارٹری میں تجربہ شدہ حقیقت نہیں۔ لیکن سائنس دانوں کو یہ نظریہ بہت پسند ہے' کیونکہ اس سے کسی ''خالقِ کائنات

اور مدبّرِ عالم'' کو ماننے کے عقیدے سے گویا جان چھوٹ جاتی ہے اور قرونِ وسطیٰ کے جاہل پادریوں نے سائنسی ارتقاء کے خلاف جو محاذ آرائی کی تھی اس سے انتقام کی پیاس کو تسکین مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام اور مسلم علماء کبھی بھی علمی، عقلی اور سائنسی ترقی کے دشمن نہیں رہے اس لئے سائنس اور مذہب کے درمیان دشمنی کی یہ فضا مشرق میں پیدا نہ ہوسکی جو یورپ اور مغربی دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ بلکہ دینی علوم میں اجتہادی بصیرت رکھنے والے تاریخ، کیمیا (کیمسٹری)، طبیعیات (فزکس) وغیرہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ اب سے تین سو سال قبل شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے نظامِ کائنات کے بارے میں اپنے دَور کی سائنسی معلومات پر قرآن حکیم کی روشنی میں غور کر کے تخلیق و تدبیرِ عالم کے جو اصول بیان کئے ہیں وہ جہاں عقل اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں وہیں قرآن حکیم سے بھی ان کی مکمل تائید ہوتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ اس کائنات کا نظام خود کار مشینی نظام نہیں، بلکہ اس کا ایک خالق اور مدبّر ہے جو کمالِ علم و قدرت اور زبردست حکمت کے ساتھ اپنے محکم قوانین کے مطابق اس عالم کا نظام چلا رہا ہے۔ اپنی مایۂ ناز تحقیقی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف ابواب میں انہوں نے تدبیرِ عالم کے جو قوانین بیان کئے ہیں ہم ان کو ایک ترتیب کے ساتھ یہاں ایک جگہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

تدبیرِ عالم کے بنیادی قوانین

قرآن حکیم کی تعلیمات سے جن کی تصدیق مشاہدے سے بھی ہوتی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا وجود اور اس کے اندر رونما ہونے والے واقعات و حوادث درج ذیل اسباب سے رونما ہوتے ہیں:

۱) عناصر اور موجودات کے وہ خواص جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت کئے ہیں، علمِ طبیعیات (فزکس) میں ان ہی خواص کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں عناصر کے ان اثرات کی تصدیق جگہ جگہ موجود ہے۔

۲) عناصر سے مرکب مختلف انواع کے خواص سے، مثلاً عناصر کا جو مرکب شیر

(Lion) بنتا ہے اس کی جسمانی ساخت' اس کی غذائی ضروریات اور اس کے مزاجی رجحانات سب شیر کی نوع کے مطابق ہوتے ہیں۔ اسی طرح دیگر انواع مثلاً ہرن' بلی' چوہا' سانپ اور نیولہ یا انسان ہیں۔ حیوانات کے علاوہ نباتات کی مختلف انواع اور جمادات اور معدنیات کی مختلف اقسام کے خواص کا یہی حال ہے۔ چنانچہ عناصر کے کسی مرکب کے بارے میں یہ فیصلہ کہ وہ مثلاً کھجور بنے' ان معاملات کا بھی فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس کا درخت' اس کے پتے' اس کے پھول اور اس کے پھل ان خصوصیات کے حامل ہوں گے جو کھجور کی نوع کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۳) دورِ حاضر میں حیوانی و نباتی جینز (genes) کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر جین کے اندر نہ صرف نوعی خصوصیات بلکہ ہر فرد کی خصوصیات کا بھی مکمل خاکہ موجود ہوتا ہے' حتیٰ کہ کسی فرد کا ایک جین لے کر اگر اس کو قدرت کے تخلیقی نظام سے گزارا جائے تو اس سے اس فرد کی ہو بہو نقل تیار ہو جائے گی جس طرح کسی تحریر کی فوٹو کاپی ہوتی ہے۔ چنانچہ متعدد جانوروں کی کلون تیار بھی کی جا چکی ہیں۔ صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ رحم مادر میں بچے کی تخلیق کا عمل ابھی جاری ہی ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک فرشتہ ہر بچے کے بارے میں یہ باتیں آ کر لکھ دیتا ہے:

ا) اس کو دنیا میں کتنی مہلت عمل دی جائے گی۔

ب) وہ اس مہلت میں کس کردار کا مظاہرہ کرے گا۔

ج) وہ کامیاب اور خوش بخت ہوگا یا ناکام اور بدقسمت۔

د) اس کو کتنا رزق عطا کیا جائے گا۔

مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے:

''ہر چیز (ٹھیک ٹھیک) منصوبے (تقدیر) کے مطابق ہوتی ہے' حتیٰ کہ کسی شخص کا نااہل اور نادان ہونا یا دانا اور باصلاحیت ہونا''۔

۴) مختلف مفرد عناصر کے باہم ملنے سے مخصوص اثرات اور خواص رکھنے والے

کچھ دوسرے مرکبات کا پیدا ہو جانا۔ مثلاً بھاپ، مختلف قسم کی گیسیں، مختلف معدنیات، نباتات، حیوانات اور دیگر تمام مخلوقات..... جن کی بناوٹ میں ایک سے زیادہ عناصر شامل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرعون کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے خطاب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ۞ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ۞ مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی ۞﴾ (طٰہٰ:۵۳_۵۵)

''(ہمارا رب وہ ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا، اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے نباتات کے مختلف جوڑے اگا دیئے۔ تم (بھی) کھاؤ اور اپنے مال مویشی بھی چراؤ۔ اس میں عقل والوں کے لئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔ ہم نے تم کو اسی (زمین) سے پیدا کیا ہے، پھر ہم تم کو اسی میں واپس لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو ایک بار پھر باہر لائیں گے''۔

یہ چاروں اسباب جن کو بالاختصار اوپر بیان کیا گیا ہے ایسے اسباب ہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے سے گزرتے ہیں۔ ان اسباب کا وجود میں آنا اور اپنے اپنے خواص واثرات کا اظہار کرنا اللہ تعالیٰ کی دو صفات کے تحت ہے:

(د ا) ابداع: یعنی کسی مادّے کے بغیر کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۱۱۷)

''(وہ) آسمانوں اور زمین کا موجد ہے''۔

ایک حدیث شریف میں آیا ہے:

((کَانَ اللّٰهُ وَلَمْ یَکُنْ شَیْءٌ))

''اللہ اس وقت بھی موجود تھا جب کچھ اور (موجود) نہ تھا''۔

(د ر) خلق: دوسری صفت خلق ہے، یعنی موجود مادّے کے ذریعہ کسی چیز کو وجود

میں لانا۔ صفت خلق کا مشاہدہ تو ہر شخص ہمہ وقت کر رہا ہے۔ ہم تو ابداع اور خلق دونوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اسی پر یقین رکھتے ہیں۔

تاہم تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ مادے کے اندر آغازِ کائنات میں جو مفروضہ زوردار دھماکہ ہوا تھا' اس کی وجہ سے مادّے نے یہ سب شکلیں خود بخود اختیار کر لیں' تو بھی بے شمار سوالات لاینحل رہ جاتے ہیں۔ مثلاً:

۱) زمین سورج سے موجودہ فاصلے پر رہ کر ہی کیوں سورج کے گرد گھوم رہی ہے؟ کہ سورج کی اتنی ہی حرارت کرۂ ارض کو ملے جتنی حرارت سے یہاں کا کاروبارِ حیات چل رہا ہے۔ ذرا فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو زمین پر برف ہی برف ہوتی' یا ذرا فاصلہ کم ہو جاتا تو زمین کی ہر چیز جل بھن جاتی ہے اور دونوں صورتوں میں یہاں زندگی ناممکن ہو جاتی۔

۲) زمین اپنے محور پر ۲۷ ڈگری ہی جھکے جھکے کیوں گردش کر رہی ہے۔ اگر جھکاؤ کچھ زیادہ یا کچھ کم ہوتا ہے تو رات و دن کی آمد و شد کا نظام یہ نہ ہوتا جو اس وقت ہے اور جو نظام کرۂ ارض پر بقائے حیات کا وسیلہ ہے۔

۳) زمین سورج کے گرد جس بیضوی دائرے میں گھوم رہی ہے اس دائرے کی شکل اور وسعت میں کچھ کمی یا زیادتی کیوں نہ ہو گئی کہ موسموں کا موجودہ تغیر جو زندگی کے ساتھ سازگار ہے وہ نہ ہوتا۔

۴) اور سب سے اہم سوال یہ کہ زندگی اور حکمت و دانائی جو خود مادّے میں موجود نہیں وہ مادّے سے پیدا ہونے والی مخلوق کو کہاں سے مل گئیں؟

یہ چند بڑے بڑے سوالات تو ہم نے بطور مثال بیان کئے ہیں۔ ورنہ یہاں تو قدم قدم پر اسی طرح کے بے شمار سوالات پیدا ہوتے ہیں' جن سوالات میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان عناصر اور موجودات میں یہ ہم آہنگی کیسے پیدا ہو گئی ہے جس کا ہمہ وقت ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قرآن حکیم کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ یہ ہم آہنگی اسی

''مدبّر عالم'' کی منصوبہ بندی اور تدبیر کا نتیجہ ہے جو اس کائنات کا موجد اور خالق ہے۔
سورۃ الزمر میں اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۞ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ۚ یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۚ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ۞﴾ (آیات:۵'۶)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو ایک معین مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو خدمت میں لگا دیا ہے۔ سب ایک مقررہ مدت کے لئے سرگرم ہیں۔ سنو! وہی غالب اور (غلطیوں) کی بہت پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ تم کو اس نے ایک ہی متنفس سے پیدا کیا' پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لئے چوپاؤں میں سے آٹھ جوڑے بنائے۔ تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تین تاریکیوں (پردوں) کے اندر وہ تم کو ایک بناوٹ کے بعد دوسری بناوٹ میں تخلیق کرتا ہے۔ یہی اللہ تو تمہارا ربّ (مالک' پروردگار) ہے۔ اسی کے لئے (اس کائنات کی) بادشاہی ہے' اس کے علاوہ کوئی اللہ (معبود' اختیار و اقتدار کا مالک) نہیں' پھر تم کو کس طرف پھیرا جا رہا ہے؟

سورۃ الشوریٰ کی آیات ۴۹'۵۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿لِلّٰهِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ ۞ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ۚ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ۞﴾

''اللہ تعالیٰ (کردار و اخلاق کی آزمائش کے لئے) کسی انسانی جوڑے کو لڑکیاں ہی لڑکیاں' کسی جوڑے کو لڑکے ہی لڑکے اور کسی کو لڑکیاں اور لڑکے دونوں ہی عطا کرتا ہے اور جس جوڑے کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے' بے شک

وہ علم والا' قدرت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا یہ تخلیقی عمل اسی طرح زمانۂ ماقبل تاریخ سے چلا آ رہا ہے لیکن اس میں اس کی منصوبہ بندی کی شان پوری طرح جلوہ گر ہے۔ چنانچہ دنیا کے کسی بھی خطے اور کسی بھی قوم کے اندر مَردوں اور عورتوں کی تعداد میں کبھی اتنا زیادہ عدم تناسب نہیں رونما ہوا کہ ان کے باہمی جوڑے سرے سے نہ بن سکیں اور معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے۔

پھر اس مدبّر عالم نے مخلوق کے ساتھ اپنی رحمت و شفقت کے تقاضے کے مطابق تدبیرِ عالم کے لئے کچھ اصول مقرر فرما لئے ہیں جن کے مطابق کمالِ حکمت کے ساتھ وہ اس کائنات کا نظم چلا رہا ہے۔ ان اصولوں میں سے بعض اصول' جو ہماری فہم کی گرفت میں آ سکتے ہیں اور جو قرآن حکیم میں بیان فرما دیئے گئے ہیں' ان اصولوں کو ہم شاہ ولی اللہؒ کی تشریح کی روشنی میں یہاں بیان کر رہے ہیں:

۱) ان میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عناصر میں جو اثرات و خواص رکھے ہیں وہ ان سے جدا نہ ہوں۔ آگ کا کام جلانا ہے تو وہ ہمیشہ یہ کام کرے۔ پانی سے ہمیشہ برودت و رطوبت پیدا ہو' وہ بلندی سے پستی کی طرف رواں ہو' اپنی سطح برابر رکھے اور جس برتن یا جگہ پر ہو وہی شکل اختیار کر لے۔

اسی طرح مخلوقات کی مختلف انواع اور اقسام میں جو خصوصیات رکھی ہیں وہ ان میں موجود رہیں۔ درندے گوشت کھائیں' چوپائے گھاس سے بھوک مٹائیں' پرندے ہواؤں میں اڑیں' مچھلیاں پانی میں تیریں اور اپنے لئے آکسیجن پانی سے حاصل کریں۔ انسان سیدھا کھڑا ہو' اپنے ہاتھوں کو آزادانہ استعمال کرے' بول چال کی قدرت رکھتا ہو اور معلومات کو جمع کر کے اِن سے غیر معلوم کا علم حاصل کر لے۔

۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ ان عناصر اور موجودات میں ظاہری تصادم اور ٹکراؤ کے نتیجے میں ان کے درمیان ایسی ہم آہنگی اور توافق پیدا ہو جائے جس سے کائنات کا نظام نہ صرف قائم رہے بلکہ ترقی اور بہتری کی جانب رواں دواں رہے۔ چنانچہ دھوپ کی حرارت اور پانی کی برودت اور رطوبت کے باہمی ظاہری ٹکراؤ سے بھاپ وجود

میں آ جائے جو بادلوں اور بارش کی شکل اختیار کر کے روئے زمین میں زندگی اور روئیدگی کا ذریعہ بنے۔ اس طرح دنیا میں مجموعی طور پر نفع بخش اشیاء کو باقی رکھا جائے اور جو اشیاء افادیت سے خالی ہوں یا نقصان دہ ہوں ان کو مٹا دیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ (الرعد:۱۷)

''اور جو چیز انسانوں کے لئے فائدہ مند ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے' رہا جھاگ تو وہ خشک ہو کر مٹ جاتا ہے''۔

قرآنی اصول کے مطابق تنازع للبقاء (Struggle for Existence) نہیں بلکہ توافق للبقاء (Hormony for Existence) اور بقائے اصلح (Survival of the fittest) نہیں بلکہ بقائے انفع کے قانون کائنات میں سرگرم عمل ہیں۔

۳) مذکورہ بالا اصول صرف کرۂ ارض میں ہی نہیں بلکہ پوری کائنات میں کارفرما ہیں۔ چنانچہ سورج اور چاند اور زمین کی دونوں گردشیں سب ان ہی اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۝﴾ (النحل:۱۲)

''اور اس نے خدمت میں لگا دیا ہے رات اور دن کو اور شمس و قمر کو' اور ستارے بھی اس کے حکم سے خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ بے شک اس میں سمجھنے والی قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔''

۴) انسان کا طبعی وجود بھی انہی قوانین کا پابند ہے جن کی پابندی دنیا کی دیگر تمام مخلوقات' نباتات اور حیوانات کر رہے ہیں۔

تاہم انسان دیگر تمام مخلوقات سے اپنی عقلی اور فکری صلاحیت کی بنیاد پر کچھ الگ قوانین کا پابند ہے۔ اس کی اس عقلی صلاحیت کو شاہ ولی اللہؒ اسلامی تعلیمات کی روشنی

میں روحِ مَلکوتی کہتے ہیں جو اس حیوانی عقل سے بہت مختلف اور برتر ہے جس کا مشاہدہ حیوانات کے اعمال میں کیا جاتا ہے۔ جہاں تک حیوانی عقل کا تعلق ہے اس کے تحت انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح اپنی جسمانی ضروریات کے لئے مناسب غذا' موسمی حالات سے بچنے کے لئے مناسب پناہ گاہ' دشمنوں سے بچنے کے لئے مناسب دفاع اور اپنی نسل کی بقا کے لئے جنسی مطالبہ کو پورا کرتا ہے۔

تاہم انسان کے اندر جو روحِ مَلکوتی موجود ہے اس کے تقاضے دیگر حیوانات کے تقاضوں سے یکسر مختلف ہیں۔ ان تقاضوں میں ایک تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال میں خیر و شر کی تمیز قائم کرتا ہے۔ اس تمیز کے مطابق وہ ایک طرف اپنے معاشرے میں ایسے ضوابط جاری کرتا ہے جن کے تحت اچھے کام کرنے والے کو انعام اور برے کام کرنے والے کو سزا مل سکے۔ نیز جن اعمال پر وہ اپنے ضوابط کے تحت جزا اور سزا نہیں دے پاتا ان کے بارے میں توقع کرتا ہے کہ ان پر بھی کسی نہ کسی طرح کی جزا اور سزا ملے۔ پھر اس کی توقع کے مطابق کچھ انفرادی معاملات میں اور اکثر اجتماعی اعمال کی جزا اور سزا کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ تاہم بہت سے اچھے کاموں پر انعام' اسی طرح برے کاموں پر سزا' انسان کی توقع کے مطابق نظر نہیں آتی بلکہ بعض وقت تو نتائج توقع کے بالکل برعکس ظاہر ہوتے ہیں۔

۵) اس مشاہدے سے دنیا میں ہونے والے حالات و واقعات کے ظہور کا پانچواں اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ خیر اور اعمالِ شر کے اثرات و نتائج جزا اور سزا کی صورت میں ظاہر ہوں۔ اور اگر بعض صورتوں میں فوری طور پر ایسا نہ ہو سکے تو کچھ مدّت گزر جانے کے بعد حتیٰ کہ انسانی زندگی کے خاتمے کے بعد ان نتائج کو انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ضرور ظاہر ہونا چاہئے۔

ان پانچ اصولوں میں سے پہلے چار اصول تو سائنس دانوں اور مادّہ پرستانہ فکر رکھنے والوں کے نزدیک بھی مسلّم ہیں' البتہ پانچواں اصول جو اگرچہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور تجربات سے ثابت شدہ ہے مگر ''مذہب دشمنی'' کے تحت اسے یہ لوگ کم از

کم زبان سے ماننے پر آمادہ نہیں۔

اسباب میں تصادم اور تدبیرِ عالم کے تقاضے

مذکورہ بالا اصول وقوانین کے تحت نظامِ عالم بغیر کسی خلل کے رواں دواں ہے۔ ان اصولوں اور قوانین کے بے لاگ اور بے لچک عمل ہی کو دیکھ کر مادّہ پرستوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ یہ کائنات ایک خود کار نظام کے مطابق کام کر رہی ہے' چنانچہ اس کو چلانے کے لئے کسی مدبّر کی ضرورت نہیں' بس مادّے میں ایک بار جو حرکت پیدا ہوئی اس حرکت نے اس پوری مشین کو متحرک کر دیا اور اب سارے واقعات وحوادث اور تمام موجودات اسی مشینی حرکت سے رونما ہو رہے ہیں۔

جبکہ قرآن حکیم نے متعدد آیات میں واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عناصر کو ان کے خواص کے ساتھ نہ صرف پیدا کیا بلکہ ان عناصر اور ان کے خواص کو اپنے منصوبوں کے لئے اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ استعمال بھی کر رہا ہے' کیونکہ وہ صرف خالق نہیں بلکہ مدبّر بھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۗ﴾ (القصص:٦٨)

''اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (اس پیدا کرنے میں) انتخاب کرتا ہے۔ (انتخاب کا یہ) اختیار ان کو حاصل نہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (السجدة:٥)

''وہ آسمان (اوپر) سے زمین (نیچے) تک نظم کا منصوبہ جاری کرتا ہے پھر اسی کی طرف یہ منصوبہ واپس جاتا ہے اور یہ سارا کام ایک دن میں مکمل ہوتا ہے جو دن تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔''

اس تدبیر اور منصوبہ بندی کے بے شمار نمونوں کا تذکرہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔ تاہم ان نمونوں کے بیان میں اس دور کی معلومات ہی سے استفادہ کیا گیا ہے تاکہ سامعین اور مخاطبین بات کو سمجھ سکیں۔ پھر بھی ان میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے

جو آج تک کے کسی سائنسی تجربے سے متصادم ہو۔

اختصار کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہاں صرف ایک قرآنی نمونہ پیش کر رہے ہیں جس کا ذکر سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۹ اور ۵۰ میں ہے۔ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے تخلیقی انتخاب کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں آزمائش کے جس مقصد سے بھیجا ہے اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ انتخابِ تخلیق کے تحت کس طرح خود فیصلے فرماتا ہے:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝﴾

''اللہ کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے' جس چیز کا انتخاب کرتا ہے اسے پیدا کرتا ہے' (چنانچہ) جس کو چاہتا ہے لڑکیاں ہی لڑکیاں عطا کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے لڑکے ہی لڑکے دے دیتا ہے' یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی عطا فرما دیتا ہے' اور جس کو چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے بیشک وہ علم بھی رکھتا ہے اور قدرت بھی''۔

ظاہر ہے کہ انسان کے کس جوڑے کو کیا دے کر اور کیا نہ دے کر آزمانا ہے اس کا فیصلہ اللہ کا وہ علم ہی کر سکتا ہے جو ماضی حال اور مستقبل کے ہر معاملہ پر محیط ہے اور جو اپنے علم کے مطابق تخلیق کرنے پر پوری قدرت بھی رکھتا ہے۔ بے شک وہ علیم و قدیر ہے۔

تاہم اس سلسلہ میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ جب سے انسانی تاریخ کا علم حاصل ہے اس وقت سے آج تک ایسی کوئی مثال نہیں کہ اس تخلیقی رنگا رنگی کے نتیجہ میں مردوں اور عورتوں کی عددی نسبت کے اندر کسی قوم یا ملک میں کبھی اتنا عدم توازن پیدا ہو گیا ہو جس کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کے جوڑے بننے میں غیر معمولی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قدرت رکھنے کے ساتھ علم بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی قدرت سے جو تخلیق ہوتی ہے وہ اس کے علم کی روشنی میں تیار ہونے والے منصوبے کے عین مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ کبھی بھی غیر معمولی عدم توازن پیدا نہیں ہوا' ورنہ اگر لڑکیوں

اور لڑکوں کی پیدائش کا دار و مدار محض بخت و اتفاق پر ہوتا تو تاریخ میں کبھی تو کسی علاقے میں یہ ہوتا کہ ایک مرد کے پیچھے مثلاً پچاس عورتیں ہوتیں یا اس کے برعکس صورتِ حال رونما ہو جاتی۔ کیا تدبیرِ عالم کے ثبوت کے لئے یہی ایک مشاہدہ کافی نہیں؟

آیئے اب ہم اپنے دور کے چند واقعات پر غور کریں کہ کس طرح اللہ کی تدبیر و حکمت سے تمام تخلیقی منصوبے مکمل ہو رہے ہیں:

۱) پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کی آبادی قیام پاکستان سے قبل اڑھائی لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں ایندھن کی گھریلو اور صنعتی ضروریات سندھ کے جنگلات کی لکڑی اور کوئلے یا بلوچستان وغیرہ باہر سے آئے ہوئے معدنی کوئلے سے پوری ہوتی تھیں' مگر قیامِ پاکستان کے بعد جب اس آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور یہ ایک کروڑ تک پہنچنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے زمین کی تہوں میں لاکھوں برس سے مخفی گیس کے اس خزانے کا سراغ دے دیا جو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے لئے قدرت نے چھپا رکھا تھا۔

۲) اب سے چند صدیوں قبل معاشرتی مسائل کے بعض ماہرین نے جب یہ دیکھا کہ انسانی آبادی میں ضرب (multiplication) کے اصول پر جو اضافہ ہو رہا ہے اگر بلا روک ٹوک یہ اسی طرح بڑھتا رہا تو وسائل رزق اس آبادی کے لئے کافی نہ ہوں گے' کیونکہ وسائل رزق میں جو اضافہ ہو بھی رہا ہے وہ ضرب کے اصول پر نہیں' بلکہ یہ محدود اضافہ سابقہ مقدار میں صرف جمع (addition) ہوتا ہے' لہٰذا انسانوں کو ضبط تولید پر عمل کرنا چاہئے تاکہ آبادی کا سائز اور غذائی پیداوار میں مطابقت باقی رہے اور انسانوں کی آبادی کو فاقہ کشی یا جنگوں اور وباؤں سے کم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن ان حساب لگانے والوں کو یہ علم نہ تھا کہ مشینی زراعت اور مصنوعی کھاد کے استعمال سے نیز جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعہ غیر معمولی پیداوار دینے والے بیجوں کی تیاری سے غذائی پیداوار میں کتنا زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ضبطِ تولید کی تحریک پر کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود اس تحریک سے آبادی میں اضافہ تو نہ رک

سکا البتہ تدبیرِ الٰہی نے غذائی پیداواروں میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ آبادی میں غیر معمولی اضافے کے باوجود آج بھی غذائی اجناس اصل ضرورت سے زائد ہیں' اگرچہ انسانوں کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے بعض خطے بھوک کی لعنت میں مبتلا ہیں۔

۳) تخلیقِ دنیا کے وقت سے براعظم امریکہ نہ صرف اپنے تمام معدنی ذخائر اور نباتی پیداواروں کے ساتھ موجود تھا بلکہ ہماری پرانی دنیا اور اس نئی دنیا میں اس وقت آنا جانا بھی ہوتا تھا جب جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ باہم خشکی کے راستے سے ملے ہوئے تھے۔ اسی طرح انتہائی شمال میں جاپان اور الاسکا کے درمیان خشکی کا راستہ موجود تھا اور سمندر کی طغیانی نے ان دونوں راستوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔

مگر پھر تدبیرِ الٰہی نے جب امریکہ کے تمام خزانوں کو سربمہر (Seal) کرنے کا فیصلہ کر لیا تو معلوم دنیا سے اس کا رابطہ کاٹ دیا گیا۔ ہزارہا برس پہلے جو لوگ پرانی دنیا سے امریکہ گئے وہ وہیں پھنس کر رہ گئے۔ ان کی تہذیبی اور تمدنی ترقی بھی منجمد کر دی گئی۔ وہ وحشی جانوروں کے ساتھ انہی کی طرح جنگلوں میں زندگی گزارتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ کی حکمت اور اس کی منصوبہ بندی کے مطابق وہ وقت آیا جب امریکہ میں قدرت کے خزانوں کی مہر توڑ دی گئی اور مغرب کی طرف سمندر کے راستہ سفر کر کے مشرق میں ہندوستان اور مصالحے کے جزائر تک پہنچنے کی توقع لے کر قسمت آزمانے والا کولمبس بالکل اتفاقاً امریکہ کے ساحل پر پہنچ گیا۔ پھر تو یہاں کے معدنی ذخائر اور زرخیز زمین کی کہانیاں سن سن کر یورپین اقوام میں امریکہ کو آباد کرنے کی ایک دوڑ لگ گئی۔ چنانچہ ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے یہاں کے وحشی قبائل کو زیر کرنے کے علاوہ شدید موسمی حالات کے مقابلے کے لئے یورپین آبادکار افریقہ سے غلاموں کے جہاز بھر بھر کر لائے تاکہ ان کو پر مشقت کاموں میں بے دریغ استعمال کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ کا تاریک براعظم صرف ایک دو صدیوں میں مہذب دنیا کی اس سطح پر پہنچ گیا جس سطح پر یہ مہذب دنیا ہزارہا سال میں پہنچی تھی۔ اور آج تو نوبت یہ آ گئی ہے کہ امریکہ پوری مہذب دنیا کا امام بنا ہوا ہے' اگرچہ ''فیضانِ سماوی'' سے محروم ہونے کے

باعث وہ امامِ ضلالت ہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے اعوان و انصار کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ۞ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۞﴾ (القصص: ٤١-٤٢)

''اور ہم نے ان کو اس طرح کے پیش رو (امام) بنا دیا جو آگ کی طرف (دنیا کو) دعوت دیتے تھے' اور قیامت کے دن وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ اور ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی' اور قیامت کے دن ان کو انتہائی رسوائی کے مقام پر رکھا جائے گا''۔

یہ اور اسی جیسے بے شمار مشاہدات سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ یہاں کے تمام واقعات و حوادث ایک حکیم اور دانا ہستی کے ارادہ و اختیار کے تحت وجود و ظہور میں آتے ہیں' البتہ تدبیرِ عالم کے لئے اس علیم و قدیر اور حکیم و خبیر ہستی نے کچھ اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے انہی اصولوں کے مطابق عالم کے نظم کو چلا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارا علم ناقص اور محدود ہے' اس لئے ہم ان تمام اصولوں کو تو نہیں جانتے جن کے مطابق عالم کا یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ ان میں سے محض بعض اصولوں کو ہم جان سکے ہیں جو ہمارے مشاہدے میں آ گئے یا جن کو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں بیان فرما دیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے افادات کی روشنی میں انہی میں سے کچھ کو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔

جب کائنات کے مختلف اسباب کسی موقع پر جمع ہو جائیں' ہر سبب اپنے تقاضے کو ظاہر کرنا چاہے' لیکن ان تقاضوں کے متضاد ہونے کی وجہ سے بیک وقت سب تقاضوں کا ظہور ممکن نہ ہو' مثلاً تلوار کی دھار کی تیزی کے نتیجے میں گردن کو کٹ جانا چاہئے' مگر جس کی گردن کاٹی جا رہی ہے اس کے مظلوم ہونے یا اس کے ذمے دنیا یا انسانیت کی کوئی بہت بڑی خدمت کے عائد ہونے کا اخلاقی تقاضا یہ ہو کہ اس کی گردن نہ کٹے اور اسے زندگی کی مزید مہلت ملے' تو اس جیسی صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اس سبب

کے اثر کو ظاہر کرنے کا موقع عطا کرتی ہے جو ''مصلحت کلی'' سے ہم آہنگ ہو' تا کہ کائنات کا موجودہ نظام اُس وقت تک محکم انداز میں چلتا رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے اس کو باقی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا صورت میں مظلوم کی گردن اگر نہ کٹے یا مصلح شخص پر تلوار کا وار اثر نہ کرے تو اندیشہ یہ ہے کہ لوگوں کا عالم اسباب اور ان کے نتائج کے ظہور کے بارے میں وہ اعتماد متزلزل ہو جائے گا جس اعتماد ہی کی بنیاد پر یہاں کا سارا نظام چل رہا ہے۔ لہٰذا کائنات کی ''مصلحت کلی'' کو ترجیح دیتے ہوئے مظلوم اور مصلح شخص کی گردن کٹ جائے گی اور اس کی زندگی کو مصلحت کلی پر قربان کر دیا جائے گا۔

تاہم مصلحت کلی ہی کے تحت کبھی ان مادی اسباب میں:

(ا) قبض یعنی ان کی تاثیر کو سکیڑ کے..... یا

(ب) بسط یعنی ان کے اثر کو پھیلا کر..... یا

(ج) احالے یعنی ان کے اثرات کو یکسر تبدیل کر کے ''مصلحت کلی'' کا تحفظ کیا جاتا ہے۔

مثلاً سمندر کے شدید طوفانوں کو اور ساتھیوں کی شورش کو ''قبض'' کے ذریعہ اتنا کمزور کر دیا گیا کہ کولمبس بالآخر ساحل تک جا پہنچا تا کہ امریکہ کے محفوظ اور مخفی خزانوں کو دنیا کی ترقی کے لئے بروقت کھول دیا جائے اور کرۂ ارض کے تمام باشندے ان سے مستفید ہو سکیں۔

یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مُکّے کی طاقت کو اتنا پھیلا دیا گیا کہ اس سے قبطی کی موت واقع ہو گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شاہی محل سے نکل کر مدین میں بھیڑوں کی گلہ بانی' مشکلات میں صبر اور خطرات کا سامنا کرنے کی تربیت ملی۔ یا حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے ذریعے سے اس دَور کی متمدن دنیا میں توحید کی دعوت پھیلانے کا فیصلہ ہو چکا تھا جن کی اولاد میں حضرت اسماعیلؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت یعقوبؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت عیسیٰؑ اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ جیسی جلیل القدر ہستیاں پیدا ہونے والی تھیں' کو نمرود کی آگ میں جل کر ہلاک ہونے سے بچا لیا گیا اور آگ کے اثر کو یکسر بدل کر اس کو سرد کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ مہلک ہونے کے بجائے سلامتی کا گہوارہ بن گئی۔

تدبیر عالم کے سلسلہ میں قبض، بسط اور احالے کی یہ صورتیں غیر ذی روح اشیاء کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن ذی روح اشیاء میں الہام کی مختلف صورتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مداخلت فرماتا ہے۔ چنانچہ اسی مصلحت کے تحت کسی ظالمانہ نظام کے خاتمے اور عادلانہ نظام کے قیام کے لئے الہام کے تحت کچھ لوگ عادلانہ نظام کی پرزور دعوت دینے میں اپنی زندگیاں کھپا دیتے ہیں اور کچھ لوگ جان و مال کی ہر بازی کھیل کر بھی ظالمانہ نظام کو ختم کر دکھاتے ہیں اور نسبتاً زیادہ عادلانہ نظام دنیا میں قائم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ انقلابِ فرانس سے ظالمانہ بادشاہی نظام ختم اور جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ اس کام میں جن لوگوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں ان کے سامنے کوئی ذاتی مفاد تو نہ تھا حتیٰ کہ مرنے کے بعد وہ کسی اجر و ثواب کی امید بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس آسمانی الہام کے تحت وہ اپنا فرض اسی طرح ادا کرنے میں لگے رہے جس طرح شہد کی مکھی اپنے الہامی فرائض ادا کرنے میں سرگرم رہتی ہے۔

یہ الہام کبھی تو دل میں ایک تیز اور مخفی اشارے کی صورت میں ہوتا ہے، کبھی خواب میں، یا کوئی اور قرینہ دکھا کر یہ الہام ہوتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے کے ذریعہ اپنے کسی بندے پر اسی طرح وحی نزل کرتا ہے جس کے وحی ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی، پھر اللہ کا یہ بندہ اللہ کا پسندیدہ نظامِ شریعت انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر عالم کا پہلا اصول یا پہلی بنیاد ''مصلحت کلی'' ہے جس کی وضاحت ہم نے متعدد مثالوں سے پیش کر دی۔

دوسرا اصول جو تدبیر عالم میں پیش نظر رکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں اصل مقصود نوعِ انسان ہے۔ چنانچہ انسان کے مفاد اور بہتری کو ہر چیز پر ترجیح حاصل ہے۔ زمین کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ بڑے بڑے اجرامِ فلکی سب انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح تمام ملکوتی مخلوق کو بھی انسان کے سامنے جھکنے کا حکم دے کر ان کو انسان کے مفاد میں کام کرنے پر لگایا گیا ہے۔

تدبیر عالم کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جو افراد اور اقوام اس دنیا کو بنانے اور سنوارنے

کے کام انجام دیں ان کو یہاں با اختیار بنا کر کام کرنے کا موقع دیا جائے اور بگاڑنے والوں کو اصلاح کے لئے ضروری وقت دینے کے بعد اگر وہ بگاڑنے کے عمل سے باز نہ آئیں تو ان کو اختیار و اقتدار سے معزول کر کے دوسرے مقابلتاً بہتر افراد و اقوام کو اختیار و اقتدار عطا کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس اصول کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۵۱)

''اور اگر اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین میں بگاڑ پھیل جاتا' لیکن اللہ تعالیٰ تمام لوگوں پر بہت فضل کرنے والا ہے''۔

تدبیرِ عالم کے سلسلہ کا چوتھا اصول یہ ہے کہ اگر مادی اسباب کے اثرات کو روکنا مصلحت کلی کے خلاف ہو اور ان اسباب کے اثرات کی وجہ سے خیر و شر کی جزا اور سزا کا ظہور نہ ہو سکے یا خیر کی راہ اختیار کرنے والے کو کوئی چھوٹا یا بڑا نقصان پہنچ جائے اور شر کے علم برداروں کو بظاہر بہت ترقی ہوتی نظر آئے تو یہ اس مادی عالم کا ایک built-in نقص ہے' کیونکہ یہ اصلاً ایک مادی عالم ہے۔ مادی عالم کے اس نقص کو اس کے جوڑے (زوج) یعنی جزا اور سزا کے اس روحانی اور ابدی عالم کے ذریعہ دور کر دیا جائے گا جہاں ہمارے موجودہ مادی قوانین کے بجائے اخلاقی اور روحانی قوانین کی حکمرانی ہوگی۔

اسی طرح دنیا میں بھی تو اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے' تاکہ ایک کا نقص دوسرا پورا کر دے اور دونوں مل کر اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کریں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الذّٰریات: ۴۹)

''اور ہم نے تمام چیزوں کو جوڑے جوڑے بنایا تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو (کہ اس مادی عالم کا جوڑا بھی ہے)''۔

اور یہ روحانی عالم اس مادی عالم کے اس built-in نقص کی اسی طرح تلافی کر دے گا

جس طرح ہر جوڑے میں ایک کا نقص دوسرے سے مل کر دور ہو جاتا ہے۔ تدبیرِ عالم کے ان اصولوں پر نظر ڈالئے اور پھر سورۃ الملک کی ابتدائی آیات کی تلاوت کیجئے جن میں ارشاد ہوا ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۙ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۙ﴾ (الملک: ۱۔۴)

''بڑی برکت والی ہے وہ ہستی جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی (کا یہ سلسلہ) اس لئے بنایا کہ تم کو دیکھے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے' وہ غالب ہے (برے کام پر سزا دے سکتا ہے) بہت بخشنے والا (پردہ پوش) بھی ہے (فوراً سزا نہیں دیتا)۔ اس نے سات آسمان تہہ در تہہ بنائے' تم اس رحمان کی تخلیق میں کوئی پہلو نظر انداز ہوتے نہ پاؤ گے۔ تو دوبارہ نگاہ ڈال کر دیکھو کیا تم کو کوئی کمی نظر آتی ہے؟ پھر دوسری بار نگاہ ڈالو تو نگاہ (نقص تلاش کرنے میں) ناکام تھک کر واپس آ جائے گی''۔

——— وصدق اللّٰہ العظیم ———

بانی تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** مدظلہ کی تالیف

ایجاد و ابداع عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک

تنزل اور ارتقاء کے مراحل

☆ قیمت: ۲۴ روپے ☆ عمدہ طباعت ☆ صفحات ۶۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

مسلمان اور سائنسی علوم

ڈاکٹر وقار احمد رضوی☆

اسلام میں جدید علوم کی ابتدا اُس وقت سے ہوئی جب حضرت محمد ﷺ پر پہلی وحی ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۞﴾ نازل ہوئی۔ اقرأ کے معنی پڑھنے کے ہیں اور پڑھنے ہی سے جدید علوم کا آغاز ہوا۔

اگر قرآن پاک کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے طریقِ استدلال کا اوّلین مبدأ تعقل و تفکر ہے۔ یعنی وہ جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لئے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر وہ جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے اس میں غور و فکر کرے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۞﴾ ''اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں معرفت حق کی نشانیاں ہیں''۔ اسی طرح ﴿اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ ۞﴾ اور ﴿وَاِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۞﴾ کہہ کر قرآن پاک بار بار مشاہدے اور استدلال پر زور دیتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ لوگوں میں اشیاء کی حقیقت جاننے کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ اس طرح قرآن حکیم نے مسلمانوں کو جو طریق دیا ہے وہ دراصل سائنٹیفک میتھڈ ہے' کیونکہ وہ علم بذریعہ استدلال' علم بذریعہ مشاہدہ اور علم بذریعہ تجربہ پر زور دیتا ہے۔ یہی جدید علوم کی بنیاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید علوم میں استدلال' مشاہدہ اور تجربے کی بڑی اہمیت ہے۔

اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو جدید علوم کی پوری عمارت قرآن حکیم کے سائنسی اصولوں پر استوار ہوتی نظر آتی ہے۔ قرآن اُن لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو اللہ

☆استاد کراچی یونیورسٹی' کراچی

کی نشانیوں میں غور وفکر نہیں کرتے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں ہے کہ:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ (آیت ۱۷۹)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو دل رکھتے ہیں مگر سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے' ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ قوتِ بصارت سے کام نہیں لیتے' ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں' ایسے لوگ چوپایوں کے مانند ہیں' بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔''

گویا قرآن سائنسی فکر اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔ مسلمانوں نے قرآن کی اسی طرزِ فکر کو اپنا کر غور وفکر سے کام لیا اور تجربی علوم کو اپنانے کی کوشش کی۔

چنانچہ اسپین کے مسلمانوں نے نہ صرف میڈیکل سائنس (طب) بلکہ سرجری (جراحت) اور فارمیسی (ادویہ سازی) میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اس سلسلے میں ابوالقاسم الزہراوی نے اپنی کتاب میں سرجری سے متعلق نئے نظریات بیان کئے' اہلِ مغرب نے الزہراوی کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ الزہراوی کے علاوہ یحییٰ بن اسحٰق' ہارون بن موسیٰ' ابن الہیثم (۱۰۳۹ء)' ابن وافد' البکری اور ابنِ زیدوہ نام ہیں جنہوں نے میڈیکل سائنس میں تحقیقی کام انجام دیئے اور جن سے یورپ نے استفادہ کیا۔ اندلس کے طبیبوں نے یورپ کو علم الابدان' علم ادویہ اور جراحت کی تعلیم دی۔ عرب کے خالد بن یزید اور اندلس کے جابر بن حیان کیمیا کے موجد تھے۔ یورپ کے مسلم سائنس دانوں نے تیزاب' شورہ' پوٹاش' مرکری' فاسفورس' آکسیجن اور ہائیڈروجن کو دریافت کیا۔

بنی اُمیہ کے دَور میں مسلم سائنس دانوں نے دِمشق میں فلکی رصد گاہیں قائم کیں اور کیمیائی تجربے کئے۔ خلفائے بنی عباس کے دَور میں جدید علوم کو بے پناہ فروغ ہوا۔ اندلس کے اموی خلفاء نے نہ صرف سائنس کی سرپرستی کی بلکہ جدید علوم سے یورپ کو روشناس کرایا۔

خلفائے بنی عباس ہارون و مامون کے زمانے میں یونانی فلاسفہ کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ مامون نے بغداد میں ایک دارالحکمت قائم کیا تھا جس میں یحییٰ بن موسیٰ، حنین بن اسحٰق، ابو یحییٰ بن الطریق جیسے علماء وفضلاء اس کام پر مامور تھے۔ حنین بن اسحٰق نے افلاطون کی کتاب السیاسۃ کا ترجمہ کیا۔ حکیم جالینوس اور بقراط کی کتابوں کے تراجم بھی پہلی بار ہوئے۔ اس زمانے کے مسلم فلاسفہ آج کے سائنٹرسٹ تھے۔ حکیم رازی (۸۶۴ء) ابن سہیل کے جانشین تھے جن کی علمی حیثیت مسلّمہ ہے۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی دنیا کے پہلے طبیب تھے جنہوں نے چیچک اور خسرہ کا پتہ لگایا۔ رازی کے علاوہ ابنِ سینا (۱۰۳۷ء)، یعقوب بن اسحاق الکندی، الفارابی (۹۵۰ء)، المعری اور ابوحیان توحیدی کی کتابوں سے اہلِ مغرب نے خوشہ چینی کی۔

تجربی تحقیق پر سائنس کی بنیادیں استوار کرنے کا باقاعدہ کام مسلمانوں کے ہاں الکندی اور جابر بن حیان نے کیا۔ جابر بن حیان جدید علوم میں تجرباتی کیمیا کا بانی ہے۔ ابنِ سینا نے سب سے پہلے طبیعیات کو تجربی علمیت میں بدل دیا۔

سائنس، طب، فلسفہ، حکمت کے علاوہ مسلمانوں نے فلکیات، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ میں نمایاں کام کئے۔ چنانچہ الجبرا مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ الخوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلہ کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا تو یورپ فن الجبرا سے واقف ہوا۔ الخوارزمی نے الجبرا کی بنیاد ڈالی جو یونانیوں کی خاص مقدار سے اضافیت کی طرف ایک قدم ہے۔ ابوجعفر محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۷۸۱۔۸۵۰ء) اسلام کے عظیم سائنس دانوں میں تھا۔ وہ ریاضی میں جدید یورپ کا معلم تھا۔ اس نے فلکیاتی جدولیں اور زیچ ترتیب دیں۔ رصد کے آغاز سے پہلے علمائے نجوم اس کی بنائی ہوئی تقویم (جنتریوں) پر اعتماد کرتے تھے۔ الخوارزمی نے سب سے پہلے عربی ہندسے استعمال کئے اور اسی کی کتاب الجبر والمقابلہ کے ذریعے ہندسے یورپ پہنچے۔ الخوارزمی کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بطلیموس کے جغرافیہ کی اصل کتاب کی علیحدہ تصحیح کی اور اس کو صورۃ الارض کے نام سے عربی میں منتقل کیا۔

خیام نے جیومیٹری کو علم کے مرتبہ تک پہنچایا اور ہندسہ کے بعض نئے تجربے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ الکندی نے جدید حساب کی بنیاد رکھی۔ ابوالقاسم مجریطی بہت بڑا حساب دان تھا' انہوں نے رصد گاہ بنائی' اصطرلاب ایجاد کیا اور ستاروں کی رفتار و حرکت کے نئے نئے مشاہدے کئے۔

جغرافیہ کے میدان میں بھی مسلمان سائنس دانوں نے غیر معمولی مہارت حاصل کی۔ ابوالفدا پہلا جغرافیہ نویس ہے جس نے علم جغرافیہ کی بنیاد رکھی۔ یعقوبی تاریخ دان ہونے کے ساتھ ساتھ جغرافیہ دان بھی تھا۔ اس نے کتاب البلدان لکھ کر اس علم میں گراں بہا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ ابن الحوقل اور یاقوت حموی کی کتاب معجم البلدان بھی جغرافیہ کی اہم کتاب ہے جس سے زرعی اور صنعتی جغرافیہ کی بنیاد پڑی۔ الخوارزمی نے ''صورۃ الارض'' لکھ کر نقشہ نویسی کی تحقیق کی۔ چودھویں صدی عیسوی تک یہ تصنیف علم جغرافیہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ بنی رہی۔ البیرونی نے روس اور شمالی یورپ کا جغرافیہ تحریر کیا۔ الادریسی نے دنیا کا کٹورا نما نقشہ بنایا جس کو بعد میں یورپ کا کام تصور کیا گیا۔ قطب الدین نے بحیرۂ روم کا نقشہ بنایا۔ محمد بن موسیٰ وہ مسلمان سائنس دان ہیں جنہوں نے دنیا میں سب سے پہلے کرۂ ارض کی پیمائش اور اس کے متعلق آلات ایجاد کئے۔ پوری ارضیاتی سائنس کا دارومدار اسی ایجاد پر منحصر ہے۔

ابن الہیثم بصیریات کا بانی تھا۔ الخازن وہ پہلا سائنس دان ہے جس نے رقیق کی کثافت اور درجہ حرارت معلوم کرنے کے لئے باد پیما استعمال کیا۔ انہوں نے ایسی ترازو ایجاد کی تھی جس سے پانی اور ہوا میں ٹھوس کا وزن معلوم کیا جا سکتا ہے۔ الخازن ہی کی ایجاد سے گلیلیو نے فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح مسلمان ماہرین نجوم نے زمین کا محیط دریافت کر لیا تھا اور یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ زمین گول ہے اور متحرک ہے۔ اسی بنیاد پر گلیلیو نے بعد میں اس بات کا دعویٰ کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے لیکن یہ نظریہ مسلم سائنس دان کا ہے جس کو بعد میں گلیلیو کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ مسلمان سائنس دان اساحر دنے نظریہ ماہتاب پیش کیا جس میں انہوں نے چاند کے گرد بیضوی راستے

کا تعین کیا۔ جابر بن حیان نے کم وبیش پانچ سو مطالعاتی تحریریں چھوڑیں اور بہت سے ایسے آلات ایجاد کئے جو آج بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ الرازی نے طبعی انسائیکلو پیڈیا تحریر کی جو ایک عظیم الشان سائنسی کارنامہ ہے۔

ابن نفیس وہ پہلا سائنس دان ہے جس نے بلڈ پریشر کو دریافت کیا جس کو وہ ضغط الدم کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی طرح فنیات میں بھی مسلمانوں کے کارنامے کسی طور پر کم نہیں۔ مسلمانوں کے تیار کردہ فلکیاتی آلات کے ذریعہ ہی جغرافیہ اور بحری سفر میں سہولتیں میسر آسکیں۔

قرآن پاک کی آیت کا مفہوم ہے کہ جو لوگ کائنات کی مسافت میں غور وفکر کرتے ہیں وہی لوگ فلاح پانے والوں میں ہیں۔ اس سے زمین کے محیط اور قطر کی پیائش کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ یہ کام قرآن کی روشنی میں مسلمانوں نے انجام دیا اور بتایا کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے' سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا' جیسا کہ یونانی حکیم بطلیموس کا خیال تھا۔ فلکیات میں مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اسے بطلیموسی نظام سے نکال کر طبعی حقائق کے نام تک پہنچایا۔ نصیر الدین طوسی نے سورج کے گرد زمین اور دیگر سیاروں کے گردش کا ماڈل تجویز کیا۔ اس کام کو قطب الدین شیرازی اور ابن شاطر نے آگے بڑھایا۔

قرآن پاک کی آیت ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیۃ:۱۳) ''اس نے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب کا سب تمہارے لئے مسخر کر دیا''۔ اس آیت کریمہ سے خلائی دَور کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس کی روشنی میں مسلمانوں نے فطری سائنس کو عملی افادی صورت دی اور میکانکی ایجادات کا رخ اختیار کیا۔ چنانچہ ہوا میں اڑنے والی شٹل سب سے پہلے اسپین کے مسلمانوں نے ایجاد کی۔

اسی طرح قرآن مجید نے معاشی سائنس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد:۱۱) ''اللہ اس قوم

کی حالت نہیں بدلتا جس کو خود اپنی حالت کے بدلنے کا احساس نہ ہو''۔ اس آیت کریمہ میں قرآن نے عمرانی نظریۂ حیات بیان کیا ہے جو خود سماجی تغیر سے عبارت ہے۔ یعنی انسان اپنے عمل سے سماجی تغیر و ترقی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہاں قرآن نے معاشرے کے عمرانی خطوط کی نشاندہی کی ہے۔

اسی طرح سوشلزم نے بیسویں صدی میں جس حقیقت کو محسوس کیا ہے' یعنی دولت کے اکتناز کو روکا جائے اور دولت کی مساوی تقسیم پر زور دیا جائے' اس بات کو قرآن پاک نے آج سے چودہ سو سال پہلے دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا کہ روپے کو گردش میں رکھا جائے تاکہ دولت صرف مالداروں کے پاس اکٹھی ہو کر نہ رہ جائے۔ ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۳) عمرانی نقطۂ نظر سے اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ وہ دولت چند افراد کی مٹھیوں میں مقید نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے علاوہ قرآن نے اجرامِ سماویہ کے افادہ و فیضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ (یونس:۵)

''وہی ہے جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لئے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کر لو''۔

قرآن پاک کی اسی تعلیم کی روشنی میں تقویم کا کام مسلمانوں نے انجام دیا۔ چنانچہ موجودہ انگریزی کیلنڈر مسلمانوں کی تقویم القرطبہ کی ہو بہو نقل ہے۔

ایک اور مقام پر ارشادِ خداوندی ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ (ابراھیم:۳۲)

''اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' اور آسمان سے پانی برسایا' پھر اس پانی کے ذریعہ سے طرح طرح کے پھل پیدا کئے تاکہ تمہارے لئے رزق کا سامان ہو''۔

اس آیت مبارکہ سے آب پاشی اور زراعت کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔

غرض کتاب اللہ کی جو تعلیم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کائنات کی خلقت میں غور و فکر سے کام لے اور حقائق ہستی کی معرفت حاصل کرے۔ قرآن نے علم کی کثیر التعداد جہتیں اور سمتیں متعین کی ہیں تاکہ کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانا جا سکے۔ مسلمانوں کے یہاں علم کا بنیادی ماخذ قرآن مجید کی تعلیم اور اُسوۂ رسولؐ ہے۔ اسلامی فکر کا بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن مجید ہی نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف متوجہ کیا۔ اسلامی علوم صرف فقہ اور تفسیر و حدیث ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں ریاضی، طبیعیات، نفسیات، جغرافیہ اور تاریخ کے نام بھی آتے ہیں۔ چنانچہ ارضیات، جویات اور طبیعیات کے بارے میں قرآن میں اشارے ملتے ہیں۔

اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اَن پڑھ عربوں اور صحرا میں رہنے والے بدوؤں کو سائنسی گوشوں کے ہراول دستوں میں تبدیل کر دیا۔ قرآن حکیم نے قدرت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور ان کے علم کے لئے ذہنی ادراک اور عالمی فکری قیادت فراہم کی اور زندگی کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل دنیا کے سامنے پیش کیا جو بقائے نسل انسانی کے لئے ضروری ہے۔

قرآن کی روشنی میں مسلمانوں نے زراعت کا باقاعدہ نظام بنایا، عمرانی علوم کی بنیاد رکھی، ارض پیمائی اور بحر پیمائی کی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے جدید علوم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کا مختصر خاکہ یہ ہے:

مقناطیسی سوئی کو قطب نما میں استعمال کیا، دُوربین ایجاد کی۔ گھروں کو ٹھنڈا رکھنے کا تبریدی نظام مسلمانوں کا ہے۔ یہ کام اب ایئر کنڈیشنر سے لیا جاتا ہے۔ دھوپ گھڑی اسلامی دور میں ریاضیاتی سائنس کی اوّلین کارکردگی ہے۔ اعشاری نظام جو اِس وقت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہے، اس کا آغاز مسلمانوں نے کیا تھا۔ چنانچہ ساتویں صدی میں البیرونی نے اس سلسلے میں زبردست کام کیا۔ شماریات (Statistics) کا آغاز نصیرالدین طوسی نے کیا۔

علم مثلثات (Trignometry) کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں کے سر جاتا ہے۔ الجبرا محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی ایجاد ہے۔ ابن الہیثم نے بصریات کے علم کو فروغ دیا۔ سمندروں کے پانی کی گہرائی ناپنے کا آلہ مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے جسے آج بھی فیلومیٹر کہتے ہیں۔ ابنِ بیطار نے راکٹ سازی کی تراکیب لکھیں۔ چنانچہ حسن بن الرماح نے پہلی بار تیرھویں صدی عیسوی میں تارپیڈو اور راکٹ بنائے۔ توپ افریقہ کے ایک مسلمان سردار یعقوب نے بنائی تھی۔

زمین کے محیط کی پیمائش، جغرافیہ، اجرامِ فلکی، رصد گاہ، آلاتِ جراحی، حرارت ناپنے والے آلات، اصطرلاب، یہ سب مسلمانوں کے تجربی علوم کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح پندرھویں صدی عیسوی کے آتے آتے مسلمان جدید علوم کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ اُس وقت یورپ دورِ تاریکی میں تھا۔ اس کے علاوہ فن تعمیر، انجینئرنگ اور علم تشریح ساخت (Anatomy) میں بھی مسلمانوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

دنیائے تاریخ میں ابنِ خلدون نہ صرف بڑا تاریخ دان تھا بلکہ اس نے فلسفۂ تاریخ کا تصور پیش کیا۔ وہ فلسفۂ تاریخ کا بانی اور یگانہ روزگار عالم تھا۔

قرطبہ اور بغداد مسلمانوں کے دو اہم علمی مرکز تھے۔ قرطبہ یونیورسٹی کا نظامِ تعلیم وہی تھا جو آکسفورڈ، کیمبرج اور برلن یونیورسٹیوں کا ہے۔ بغداد میں ابوجعفر منصور اور مہدی کے زمانے میں یونانی علوم کے تراجم ہوئے۔ ابنِ تیمیہ (۱۳۳۸ء)، ابن حزم اور ابوبکر رازی نے یونانی فکر پر شدید اعتراضات کئے اور استقرائی طریق استدلال پر زور دیا۔ مغرب نے استقرائی طریقِ استدلال مسلمانوں سے سیکھا۔ چنانچہ بیکن نے استقرائی (Inductive) طریقے کی وکالت کی۔ بیکن (۱۵۶۱ء۔۱۶۲۶ء) نے اسلامی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی کتاب اوپس ماژس (Opus Majus) ابن الہیثم کی بصریات کا چربہ ہے۔ بیکن کی اس کتاب پر ابنِ حزم کے بھی اثرات ہیں۔ بیکن سے پہلے مسلمانوں میں امام غزالی (۱۱۱۱ء) اور ابنِ رشد (۱۱۹۸ء) جیسے عقلی مفکرین گزر چکے تھے۔ غزالی کی تصانیف کے تراجم اسپینی زبان میں ہو چکے تھے۔ بیکن

نے استقرائی طریق استدلال انہی مسلم مفکرین سے سیکھا۔

ڈیکارٹ نے شک سے اثبات کا راستہ نکالا۔ یہ غزالی کا مسلک ہے۔ غزالی کی کتاب ''المنقذ من الضلال ''اسی موضوع پر ہے۔ غزالی نے فلسفۂ یونان کا رد لکھا اور ''تھافة الفلاسفه'' تصنیف کی۔ ابنِ رشد نے امام غزالی کا رد ''رنة تھافة الفلاسفة'' سے کیا۔ ابنِ رشد (۱۱۲۰۔۱۱۹۸ء) یونانی افکار سے متاثر تھا۔ وہ ارسطو کا شارح تھا۔ اس کے نزدیک روح ایک شے بسیط ہے اور اصول کلی ہے اس لئے غیر فانی ہے۔

ابن رشد کے نزدیک عقل جسم کی کسی حالت کا نام نہیں' اس کی ہستی جسم سے بالاتر ہے۔ وہ مفرد ہے' عالمگیر اور دوامی ہے۔ ولیم جیمز کی کتاب (Variety of Religious Experience) میں اسی تصور کو پیش کیا گیا ہے کہ شعور کی کوئی وراء الجسم میکانکی ترکیب ہے۔

ابن رشد ایک عظیم سائنس دان اور فلسفی تھا۔ یورپ کے اکثر فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اس کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی کتابیں اب بھی یورپ کی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ابنِ رشد قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا خاندان اندلس میں فلسفہ اور سائنس میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد ابنِ زبیر نے انجکشن ایجاد کیا تھا۔ ابنِ رشد اس کا پڑپوتا تھا۔ ابنِ رشد کو یورپ میں Averrow کے نام سے شہرت دی گئی۔ ابنِ رشد' ابنِ طفیل اور ابنِ عربی (۱۱۶۴ء۔۱۲۴۰ء) کا معاصر اور دوست تھا۔ ابنِ رشد کو طب' فلسفہ' فقہ' حدیث' ا ب' منطق' ہیئت' تفسیر اور علمِ کلام میں درک حاصل تھا۔ وہ اسپین کی حکومت میں وزیرِ تعلیم اور قاضی القضاۃ کے عہدوں تک پہنچا۔ اس کا گھر ایک یونیورسٹی بن گیا تھا۔ اس کے شاگردوں میں فرانس' جرمنی اور انگلینڈ کے طلبہ شامل تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی بھی اس سے علم حاصل کرنے آتے تھے۔ ابنِ رشد نے فن طب کے امورِ کلیہ سے متعلق ایک کتاب الکلیات لکھی تھی۔ ابنِ سینا (۱۰۳۷ء) کی کتاب الشفاء اور ابنِ رشد کی کتاب الکلیات یہ دونوں کتابیں آج میڈیکل تحقیق کی بنیاد ہیں۔ ابنِ رشد نے تیزاب ایجاد کیا جو

آگ کی طرح جسم اور کپڑے کو جلا دیتا ہے اور جس سے لوہا صاف کیا جا سکتا ہے۔ یہودیوں نے فلسفہ اور سائنس ابنِ رشد سے سیکھی اور انہی یہودیوں کے ذریعہ طب' سائنس' فلسفہ اور ابنِ رشد کی کتابیں یورپ پہنچیں۔ جب یورپ اندھیروں میں گم تھا تو ابنِ رشد اپنے علم کی روشنی سے دنیا کو منور کر رہا تھا۔ اسی یورپ نے تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد ابنِ رشد کو Averrow کے نام سے یاد کیا تو لوگ سمجھے کہ یہ بھی کوئی یورپین ہے' لیکن سمجھنے والے سمجھ گئے کہ یہ تو ابنِ رشد ہے جس سے یورپ نے علم سیکھا۔

یونان کا نظریہ یہ تھا کہ کائنات ایک بے حس و حرکت وجود ہے' اس میں سکون و جمود ہے' کسی تغیر یا اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ یونان کی نظر متناہیت پر تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کائنات متناہی ہے' محدود ہے۔ اہلِ یونان کے برعکس مسلم فلسفہ نے زندگی کا حرکی تصور پیش کیا۔ الخوارزمی' طوسی (۱۲۷۴ء)' البیرونی (۱۰۴۸ء) نے اسی نظریۂ حرکت و تغیر کو فروغ دیا۔

ملا جلال الدین دوانی اور فخر الدین عراقی (۱۲۸۷ء) نے وقت کا اضافی تصور دنیا کے سامنے پیش کیا' جس پر آئن سٹائن (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۵ء) نے اپنے فلسفۂ اضافیت کی اساس رکھی۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت بہت بعد کا ہے۔ آئن سٹائن سے پہلے مسلم فلاسفہ اس نظریئے کو جنم دے چکے تھے۔ عراقی کا رسالہ ''غایۃ المکان فی درایۃ الزمان'' ہے۔ اس میں اس نے نظریۂ زمان و مکان سے بحث کی ہے۔ عراقی سے چھ سو سال بعد کانٹ (Kant) نے مغرب میں نظریۂ زمان و مکان پیش کیا۔

مغربی فلاسفہ میں کانٹ اور ڈیکارٹ نے مسلم فلاسفہ سے استفادہ کیا۔ سترھویں صدی عیسوی میں فرانس کا مشہور ریاضی دان ڈیکارٹ جو جدید فلسفہ اور ریاضی کا بانی ہے' اس نے فضا کا نیا تصور دیا۔ اس کے نزدیک فضا خارجی شے ہے جو ایتھر سے بھری ہے۔ مگر ڈیکارٹ سے پہلے بیرونی پہلا شخص ہے جس نے جدید ریاضیات کے تصورِ تفاعل کی طرف قدم بڑھایا۔

کانٹ' غزالی کے بعد پیدا ہوا۔ کانٹ کی تنقید عقل محض اشاعرہ کے نظریۂ عقل کی

آوازِ بازگشت ہے۔ اشاعرہ نے عقل کو محدود اور نارسا قرار دیا۔ اشاعرہ نے نظریۂ عینیت دیا یعنی حقیقت غیر مادی ہے اور عقل سے ماورا ہے۔ کانٹ نے اپنی کتاب (The critique of pure reason) میں عقل کی اس نارسائی کو ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ فکر متناہی ہے' اسی لئے وہ لامتناہی خدا تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ خالص اسلامی فکر ہے۔

اشاعرہ نے زمان و مکان کی محدود تقسیم کے تصور کو رد کیا۔ ان کے نزدیک زمان و مکان ایسے آدوں اور نقطوں پر مشتمل ہے جس کی مزید تقسیم نہیں ہوسکتی۔ اشاعرہ کا یہ تصور جزء لا یتجزی کا تصور ہے' جو جوہر (atom) یا جوہری تخیل کی اساس ہے' جس کی رو سے ایٹم ایک چھوٹا ذرّہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں ہوسکتی۔ گویا ایٹم کا تصور مسلمانوں کا تصور ہے۔

اشاعرہ کے نزدیک زمانہ عبارت ہے منفرد آنات (nows) کے تواتر سے' جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دو منفرد آنات یا لمحوں کے درمیان ایک ایسا لمحہ بھی موجود ہے جسے خالی کہنا چاہئے۔ گویا زمانے کا بھی ایک خلا ہے۔ اسی سے ملّا جلال الدین دوانی اور عراقی نے وقت کا اضافی تصور دیا ہے۔

آئن سٹائن نے ۱۹۵۵ء میں اپنے نظریئے (Relativity) کی اساس اسی نظریئے پر رکھی جس کا مطلب یہ ہے کہ وقت مطلق چیز نہیں' بلکہ اضافی شے ہے' کیونکہ دو متحرک اشیاء کے درمیان فاصلے یا خلا کا کوئی معنی نہیں۔ اسی لئے آئن سٹائن نے دنیا کو طول' عرض' عمق اور وقت یعنی چہار ابعادی (4-dimensional) کہا۔ آئن سٹائن سے پہلے وہائٹ ہیڈ نے بھی نظریۂ اضافیت کا انکشاف کیا تھا۔

عراقی کے نزدیک زمانے کے مراتب لا انتہا ہیں۔ وہ زمانے کو مختلف قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ امام فخر الدین رازی نے بھی زمانے سے بحث کی ہے۔ زمانے کے بارے میں امام رازی کا نظریہ معروضی ہے' لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ملّا باقر داماد نے زمانہ کو جوششِ عمل (Enlanvital) کہا ہے اس کے نزدیک زمانہ ایک

تخلیقی عمل ہے۔ ابنِ خلدون نے زمان کی حقیقت کو محسوس کیا۔ اس کے نزدیک زمانہ ایک زندہ حقیقت ہے۔

ابوالعلی المعری خدا کے وجود میں شک کرتا تھا۔ اسی سے رواقیت (Stoicism) کا فلسفہ پیدا ہوا۔ گویا یورپ نے رواقیت کا فلسفہ بھی مسلمانوں سے لیا۔

لاک عقل کے عجز اور خدا کے وجود کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا کے وجود کا تصور ممکن ہے' کیونکہ اس میں کوئی تناقض عقلی نہیں۔ لاک کی طرح کانٹ بھی خدا کو مانتا تھا۔ ہیوم (۱۷۱۱ء۔۱۷۷۶ء) جدید تشکیک پسندوں کا سرغنہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ علت و معلول کا رشتہ وہی ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ کانٹ' ہیوم کا جواب تھا۔ اسی لئے کانٹ کو اعظم المؤمنین کہا جاتا ہے۔

برگساں عقل اور دماغ میں فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک عقل قوت ہے' دماغ مادہ ہے' دماغ عقل کے لئے ایک برتن ہے۔ برگساں کا یہ نظریہ ابنِ رشد سے مستعار ہے۔ فکر حقیقت کا تجزیہ کرتی ہے' وجدان اخذ کرتا ہے' دونوں کی نشوونما ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔ برگساں کے نزدیک وجدان ایک اعلیٰ ذہن ہے۔ اسی کو اسلام عقل استقرائی کہتا ہے۔ برگساں کا وجدان اسلامی عقلِ استقرائی کی دوسری شکل ہے۔

نیوٹن نے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں قانونِ تجاذب یا نظریۂ کشش ثقل دیا۔ اس نظریئے سے مادہ' توانائی' زمان و مکان' علت و معلول کا مفہوم بدل گیا' مگر نیوٹن مطلق فضا یعنی مکان کو غیر متحرک مانتا ہے' جبکہ اسلامی تعلیمات زمان و مکان کو تسلسل و استمرار کا حامل مانتی ہیں۔

ڈارون کی کتاب ''اصل الانواع'' پر مسلم مفکر شیخ جسر (۱۸۴۵ء) کے افکار کا اثر ہے۔ ڈارون نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ ڈارون خدا کا منکر نہ تھا۔ اسپنسر (Spencer)..... (۱۸۲۰ء۔۱۹۰۳ء)..... نے ڈارون سے استفادہ کیا۔ اسپنسر حیات بعد الممات کا قائل تھا جو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

جابر بن حیان اور ابنِ مسکویہ نے دسویں صدی عیسوی میں ارتقاء کا نظریہ پیش

کیا۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اُسی کی آواز بازگشت ہے۔ ابنِ مسکویہ (۱۰۳۰ء) کا شمار معلم اخلاق اور ائمہ مفکرین الٰہیات میں ہوتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق پر اس کی کتاب بہت اہم ہے۔

عربوں میں جب علمی ترقی کا آغاز ہوا تو یونانی افکار نے انہیں قرآنی تعلیمات کی روح سے بیگانہ کر دیا' لیکن آخر کار وہ قرآنی روح سے آشنا ہوئے تو ایک زبردست فکری انقلاب لائے۔ قرآن نے انہیں متناہی سے لامتناہی کی طرف حرکت کی تلقین کی۔ یہیں سے نظریۂ زمان و مکان پیدا ہوا۔ تغیر کا مطلب ہے کائنات اضافہ پذیر ہے: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾۔ ابن مسکویہ کی طرح ابنِ خلدون بھی زمانے کے بارے میں ارتقائی اور تخلیقی قوت کا قائل تھا' کیونکہ اسلام کے نزدیک زندگی متحرک ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو یونانی نظریۂ سکون و جمود کو منہدم کرتا ہے۔

حکیم سنائی (م ۱۱۳۱ء) نے حکیم ناصر خسرو کی پیروی میں فلسفہ و حکمت کے مضامین بیان کئے۔ حکیم سنائی کے خیالات سے ذہنی انقلاب آیا۔ اس وقت غزنی میں مسعود سعد سلمان کی حکومت تھی۔

ژانٹے کا انتقال ۱۳۲۱ء میں ہوا۔ اس کی ژوائن کامیڈی ۱۵۵۵ء میں شائع ہوئی۔ مسلم محدثین' علماء' صوفیاء اور مفسرین نے سیاحتِ علوی اور مشاہدۂ تجلیات کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام روایات کو ایک جگہ رکھ کر اگر ژوائن کامیڈی کا مقابلہ کیا جائے تو مشابہت و مماثلت کے بہت سے مقامات نظر آتے ہیں۔ مثلاً بہشت و دوزخ کے مناظر سے مطابقت ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ژانٹے کی ژوائن کامیڈی کا اصل ماخذ احادیث نبویؐ ہیں جن میں معراج کی کیفیت ہے۔ اس کے علاوہ ژانٹے نے محی الدین ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ اور معری کے رسالہ الغفران سے بھی استفادہ کیا ہے۔

سرخسی (۸۹۹ء) الکندی کا شاگرد ہے۔ ابنِ حزم کے نزدیک معدوم بھی ایک جسم ہے جو حالتِ عدم میں ہے۔ ابنِ حزم اندلسی قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ اس کی کتاب ''الملل والنحل'' اہم ہے۔ اس میں منصور حلاج کا ذکر ہے۔

مسلمانوں میں کلامی مناقشات نے عقلیت کو فروغ دیا۔ اشاعرہ نے عقلیین کے نظریۂ مادہ پر ضرب کاری لگائی۔ اشاعرہ ایک تحریک تھے جس نے نویں صدی عیسوی میں عقلیت کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا۔ اس تحریک کا بانی حسن الاشعری (۸۷۳ء۔۹۴۱ء) تھا۔ اس نے علمائے معتزلہ سے عقل سیکھی اور پھر انہی کے خلاف تنقید کی۔ عقلیین کے مقابلے میں اشاعرہ صفاتِ الٰہی کے قائل تھے۔ اشاعرہ کے نزدیک خدا انتہائی واجب الوجود ہستی ہے۔ اسی لئے اشاعرہ توحید کے زبردست حامی ہیں۔ اس تصور سے یعنی عقلیت کے خلاف ردِّعمل سے مسلمانوں میں مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کو فروغ ہوا۔ اشاعرہ نے ایران کے نظریۂ ثنویت (ظلمت ونور) کو مسترد کیا۔ مامون (۸۱۳ء۔۸۳۳ء) کے دربار میں اشاعرہ اور عقلیین کے درمیان مناظرے ہوتے تھے۔

امام فخر الدین رازی (م۱۲۲۲ء) نے جبر کا نظریہ پیش کیا۔ رازی نے اس فلسفہ پر سخت تنقید کی' اس کا جواب طوسی (م۱۲۷۴ء) اور ابنِ رشد نے دیا۔ شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول (م۱۲۴۰ء) نے اپنی کتاب ''حکمۃ الاشراق'' میں وحدت الوجود سے بحث کی' وہ فلسفۂ اشراق کے بانی تھے۔ ''حقیقت نور ہے'' یہ اشراقی نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک ذات واجب نورِ محض ہے جس کا اشعاع یا اشراق تمام کائنات میں نظر آتا ہے۔ شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے یونانی فلسفہ کو ایرانی تصور میں ڈھالا۔ علماء کو یہ تاویل غلط نظر آئی' اس لئے چھتیس سال کی عمر میں اس کو قتل کروادیا۔ اسی لئے آج تک ان کو شہید کے بجائے مقتول کہا جاتا ہے۔ ان کی کتاب ''عوارف المعارف'' اہم ہے۔

نجم الدین الکاتبی کی کتاب ''حکمۃ العین'' ہے جس کی شرح ملّا مبارک نے ''شرح حکمۃ العین'' کے عنوان سے لکھی۔ اس کتاب میں جوہر کی ماہیت سے بحث ہے۔

عمر خیام (۱۰۴۴ء۔۱۱۳۳ء) لاادری تھا۔ ملّا صدری نے اپنے فلسفیانہ نظام کو منطقی قوت کے ساتھ پیش کیا۔ ملّا صدری کا فلسفہ ابنِ سینا کے فلسفے کی تجدید ہے۔

گوئٹے کا دیوان انقلابِ فرانس کے زمانے کا ہے جو جرمن قوم کے زوال کا زمانہ تھا۔ یہ وہ وقت ہے جب جرمنی کے مشاہیر ادیب اور مفکرین خارجی دنیا کی کشمکش اور ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر فطرت کی کھوج میں لگے ہوئے تھے۔ گوئٹے' حافظ و سعدی سے متاثر تھا۔ گوئٹے نپولین کا ہم عصر تھا۔ اس نے مغرب کی تہذیب کا مطالعہ کیا تھا۔ جب مغرب سے اس کی تسکین نہیں ہوئی تو وہ مشرق کی طرف جھکا اور مشرق کے دواوین کا مطالعہ کیا۔ گوئٹے' فارسی اور عربی ادب سے متاثر ہوا۔ اس نے دیوانِ حافظ کے مقابلے میں اپنا دیوان ''سلام مغرب'' لکھا۔ وہ حافظ کے علاوہ سعدی (م۱۳۱۳ء)' عطار (م۱۲۳۱ء)' فردوسی اور قرآن و حدیث سے نہ صرف واقف تھا بلکہ ان سے متاثر تھا۔ اس طرح مشرقی روح جرمن ادب میں داخل ہوئی ہے۔

ابنِ تیمیہ اور ابنِ حزم نے علم کا ماخذ احساس و شعور کو قرار دیا۔ الکندی اور البیرونی نے استقراء کے ساتھ تجرباتی طریق کار پر زور دیا۔ جاحظ اور ابنِ مسکویہ نباتی وحیوانی زندگی کے مشاہدے سے اصولِ ارتقاء کی طرف چلے۔ ابنِ خلدون نے استقرائی طریقِ تحقیق کو اختیار کیا۔ یہ وہ روشنی کے مینار ہیں جن کے مشرقی ذہن سے مغرب نے فیض حاصل کیا۔

غرض اسلام کی پہلی چھ صدیاں علوم وفنون' تہذیب وتمدن اور تاریخِ انسانی کا روشن باب ہیں۔ یہی زمانہ مغرب کی تاریکی کا دَور ہے۔ اندلس میں مسلمانوں کا جو شاندار تمدن تھا مغرب کا موجودہ تمدن اس کا پرتو ہے۔ اندلس کے مسلمان سوٹ پہنتے تھے۔ مغرب نے کوٹ' پتلون اور تہذیبی لباس اندلس کے مسلمانوں سے لیا۔ اس لحاظ سے مغربی تہذیب اسلامی تہذیب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

دراصل اسلام کو تاتاری حملوں سے شدید نقصان پہنچا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاری حملوں کے بعد مسلمانوں کی علمی ترقی کو زوال ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پانچ سو سال سے الٰہیات اسلامیہ پر جمود طاری ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب یورپ ازمنۂ مظلمہ میں تھا تو مسلمان علم و سائنس کے کارنامے انجام دے رہے تھے اور جب

مسلمانوں کو زوال ہوا تو یورپ سائنسی ترقی کا مرکز بن گیا۔ پہلے مغرب' مشرق سے استفادہ کرتا تھا اور اب مشرق' مغرب کی طرف دیکھتا ہے۔

یورپ نے عربی کتابوں کے تراجم لاطینی میں کئے اور یونانی علوم کو مسلمانوں نے محفوظ رکھا۔ یونانی کتابیں اب نہیں ملتیں۔ مسلمانوں کی کتابوں میں صرف ان کے حوالے ملتے ہیں۔ مسلمانوں نے یورپ کو کاغذ کی صنعت سے روشناس کرایا۔ اندلس سے کاغذ کی صنعت یورپ گئی۔ یہ صنعت مصر سے اندلس منتقل ہوئی۔ موسیٰ بن نُصیر کے ساتھ مصر سے آنے والے سپاہی یہ تحفہ اپنے ساتھ لائے۔ اس طرح کاغذ کی صنعت نے اندلس میں فروغ پایا۔

اسی طرح خوردبین مشہور مسلمان سائنس دان ابوالحسن نے ایجاد کی' قطب نما کے موجد اہل عرب ہیں۔ آج کل کے دور میں میزائل' ٹینک اور بکتر بند دستے اسی توپ کی جدید شکل ہیں جو سب سے پہلے فاتحِ قسطنطنیہ سلطان محمد نے تیار کرائی تھی۔ اس توپ کا گولہ ایک میل دور تک پھینکا جا سکتا تھا۔ اسی طرح جرثقیل کے آلے بھی مسلمانوں نے بنائے جو غرق شدہ جہاز کو نکالنے میں معاون ثابت ہوئے۔

مسلمانوں کے پہلے بحری بیڑے کی بنیاد ۲۸ھ میں امیر معاویہ ؓ گورنر شام نے خلیفہ سوم حضرت عثمان ؓ کی اجازت سے ڈالی۔ امیر معاویہؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس جہازوں کے کئی بیڑے تھے جنہیں اساطیل کہا جاتا تھا۔ وہ خود بحری فوج کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے' اس لئے تمام مسلمانوں میں بحری فوج میں آنے کا رجحان پیدا ہوا۔ انہوں نے بحری فوج میں سپہ سالار کا عہدہ قائم کیا جسے ''امیر البحر'' کہا جاتا تھا۔ اسی لفظ نے بعد میں ''ایڈمرل'' کی صورت اختیار کی۔ مسلمانوں نے جا بجا جہاز رانی کے کارخانے قائم کئے۔ پہلا کارخانہ مصر میں قائم ہوا۔ اس کے بعد شام کے ساحلی علاقوں میں نئے کارخانے لگائے گئے۔ امیر معاویہؓ' عبد اللہ بن ابی سرح' امیر البحر عبدالرحمٰن (۱۱۴ھ)' حبیب بن ابی عبیدہ فہری (۱۲۲ھ)' عبد اللہ مہدی (۹۰۹ھ)' امیر البحر ابوالقاسم (۱۰۳۵ھ)' سلطان محمد فاتح اور خیر

الدین باربروسا وہ مسلمان جہاز ران ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے بحری بیڑے کو طاقتور بنایا۔ مسلمانوں کی بحری طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ مسلمان جہاز رانوں کے سمندری بیڑے کے گشت کی خبر سن کر عیسائی حکمران اپنے بحری جہازوں کو بندرگاہوں سے باہر نکلنے نہیں دیتے تھے۔

غرض مسلمان چھٹی صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک دنیا کی ترقی یافتہ قوم رہے۔ مسلمانوں کو دنیا کی سب سے زیادہ متمدن اور طاقتور قوم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سترھویں صدی سے مسلمانوں پر ایسا زوال آیا کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی تک مسلمانوں کے بیشتر ممالک اقوامِ یورپ کے زیرنگیں آ گئے۔ مسلمانوں کے عروج کی وجہ ان کی سائنسی ترقی تھی۔ سات آٹھ صدیوں تک سائنس اور علم وحکمت کے میدان میں اقوامِ عالم کی قیادت کرنے کے بعد مسلمانوں کے ذہن پر ایسی کہر چھائی کہ انہوں نے علوم طبیعی سے مُنہ موڑ لیا اور تحقیق وتدقیق کے بجائے تقلید وجمود کو اپنا شعار بنایا۔

ملتِ اسلامیہ کی موجودہ پستی کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں پھر انجام نہ دیں اور سائنسی علوم کو اسی محنت اور عرق ریزی سے حاصل کریں جس طرح اہلِ مغرب نے اس پر قبضہ جما رکھا ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اس نکتے سے واقف تھے۔ انہوں نے روحانی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ مادی وسائل اور علم وحکمت کی ثروت کو بھی جمع کیا اور اقوامِ عالم کی رہنمائی کی۔

اطلاع برائے قارئین

معاون مدیر کے سفرِ حج کے باعث مارچ کا شمارہ بروقت شائع نہ ہو سکا تھا۔ لہٰذا زیرِ نظر شمارہ مارچ/اپریل کی مشترکہ اشاعت کا حامل ہے۔ اس اعتبار سے اس کے صفحات میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا

تحریر: حامد سجاد طاہر*

آج اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جہاں مغربی افکار اور نظریات کی بالادستی قائم نہ ہو۔ یوں تو آج دینِ توحید کے نام لیواؤں کی تعداد ڈیڑھ ارب کے عدد کو عبور کر چکی ہے اور پچپن سے زائد ممالک میں وہ اکثریت میں ہیں مگر اس سب کے باوجود آج روئے زمین پر کوئی ایک بھی ایسا ملک نظر نہیں آتا جسے ہم دنیا کے سامنے ایک ماڈرن اسلامی ریاست کے ماڈل کے طور پر پیش کر سکیں۔ فکری سطح پر بھی دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ آج اسلام کا دامن علم و حکمت کے آبگینوں سے خالی ہے اور وہی حکمت جو کبھی مؤمن کی میراث کہلاتی تھی آج غیروں کے گھر کی کنیز ہے۔ یہاں دانشور وہ ہے جس نے اپنی فکر کو نسیم مغرب سے سینچ رکھا ہو اور مہذب کہلانے کا حق دار وہ ہے جو مغربی اطوار کی نقالی پر فخر کرتا نظر آئے۔ اور حد تو یہ ہے کہ وہ تحریکیں جو بزعم خود مغرب کی مخالف ہیں' خود بھی بڑی حد تک مغرب سے مستعار شدہ خیالات کی حامل ہیں۔ آخر یہ سب کیوں ہے؟ قرونِ اُولیٰ کے مسلمان اور آج کے مسلمان میں فرق و تفاوت کی خلیج کیوں حائل ہو گئی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہمارے صدر صاحب ہوں یا کوئی راہ چلتا آدمی سب ہی اسلام کے گن گاتے نظر آتے ہیں' مگر پھر بھی مساجد ہیں تو نمازیوں سے خالی ہیں' مدارس ہیں تو ان پر خاک اڑ رہی ہے۔ وہ دانشور حضرات جو اغیار کا قصہ جب چھیڑتے ہیں تو زبان تسنیم و سلسبیل سے دھلی معلوم ہوتی ہے مگر جب بھی بیچارے اسلام کی باری آتی ہے تو ان کے افکار برق گراتے معلوم ہوتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اور پھر اس سب کا علاج کیا ہے؟ یا بالفاظِ دیگر موجودہ حالات میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے کرنے کا

☆متعلم ایف اے (سال اول) قرآن کالج لاہور

اصل کام کیا ہے؟

میں آنے والے صفحات میں کوشش کروں گا کہ ان سب سوالات کے تسلی بخش جوابات دے سکوں۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ آج اس ساری بحث کو چھیڑنے کا میرا اصل مقصد کیا ہے۔ میرے اصل مخاطبین طلبۂ قرآن کالج ہیں اور ع ''ارادہ ہے کہ ان کا دل پھر اِک بار گرماؤں'' کے مصداق میں انہیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتا ہوں' تاکہ شاید اِن میں سے کوئی شخص پھر سے عزم و حوصلہ لے کر اٹھے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کرے جسے دورِ زوال میں وقتاً فوقتاً اُمت میں سے بہت سے افراد نے دیکھا ہے اور جس کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا جسے آج ہم قرآن کالج کے نام سے جانتے ہیں۔ بہرحال میں نے ایسے طلبہ کے لئے جو اسلام کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں' رہنمائی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو سقراط یا بقراط تصور کرتا ہوں' بلکہ میں تو خود بھی ہدایت کا طالب ہوں' لیکن اس کے باوجود جو کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں اسے آگے پہنچانے کو اپنا فرض جانتا ہوں اور یہ بھی کہ اس تحریر کا اصل مقصد ایک جذبہ پیدا کرنا ہے اور جذبہ اگر ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو عمل کا روپ دھارنے کے لئے راہیں خود متعین کر لیتا ہے۔ تاہم میں نے ان کے سامنے مثال رکھنے کے لئے ان شخصیات اور تحاریک کا تذکرہ بھی کیا ہے جو اس ضمن میں اپنی کاوشیں صرف کر چکے ہیں' تاہم ان کی یہ کاوشیں بتقاضائے بشریت غلطیوں سے مبرا نہ تھیں۔ انہیں یہاں بیان کرنے کا مقصد ہرگز ہرگز ان کا مذاق اڑانا نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ ہم ان سے سبق حاصل کریں اور خود اِن غلطیوں سے بچ سکیں۔

یہ واضح کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس مضمون میں میرا اپنا حصہ محض چند کتب کے مواد کو جمع کر کے ترتیب دینا ہے۔ میں نے آخر میں ان کتب کی تفصیل بھی درج کر دی ہے تاکہ جن حضرات کو مزید تفصیل درکار ہو وہ اِن کتب کی طرف رجوع کر لیں۔

———☆———

اس سے پہلے کہ میں موضوع کو زیر بحث لاؤں' میں ایک اصطلاح کی وضاحت کرنا چاہوں گا جسے میں نے اوپر استعمال کیا ہے۔ وہ اصطلاح ہے ''نشاۃِ ثانیہ''۔ اس کا لغوی مفہوم ہے ''دوسری بار اٹھانا یا عروج پانا''۔ اس اصطلاح کی روشنی میں اگر ہم تاریخ اسلام کا جائزہ لیں تو بظاہر یہ غلط معلوم ہوتی ہے' کیونکہ مادی یا عسکری سطح پر اسلام کو یعنی اُمتِ مسلمہ کو دو ہی عروج اور دو ہی زوال نصیب ہوئے ہیں' جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) پہلا عروج

اسلام کو سیاسی سطح پر عروج حضور پاک ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی ملنا شروع ہو گیا تھا' مگر اس کی صحیح معنوں میں ابتدا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوئی اور اُمیین (عرب) نے اسلام کے جھنڈے کو ایک طرف فرانس کے قلب میں جا گاڑا تو دوسری طرف ایشیائے کوچک میں بھی نصب کر دیا۔ یہ دَور فی الواقع آغاز ہی میں ع ''رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا'' کا نقشہ پیش کر رہا تھا' مگر پھر معمولی اونچ نیچ کا شکار رہنے کے بعد اُمت مسلمہ روبہ زوال ہو گئی۔

(۲) پہلا زوال

خلافت عباسیہ کے دوران ہی اُمت کی وحدت ختم ہو گئی تھی اور یہ بغداد میں عباسی' قاہرہ میں فاطمی اور قرطبہ میں اُموی خلافتوں میں بٹ گئی تھی جس نے طاقت کو نقصان پہنچایا اور باقی رہی سہی کسر مغرب سے صلیبی فوجوں اور شمال سے منگولوں اور تاتاریوں کے حملوں نے پوری کر دی۔ صلیبیوں نے بیت المقدس کی عظمت کو بٹہ لگایا لیکن پھر بھی اُمیین کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور اسے بازیافت کرایا تو بھی آخرین (غیر عرب) میں سے ایک نوجوان صلاح الدین ایوبی نے' تاہم وہ بھی کوئی پائیدار قوت فراہم نہ کر سکا اور تاتاریوں نے بغداد کے الف لیلوی شہر کی داستانوں کو رہتی دنیا تک عبرت کا سامان بنا کر رکھ دیا۔

(۳) دوسرا عروج

اس کے بعد اللہ کی رحمت نے جوش مارا اور وہی تاتاری جنہوں نے عالم اسلام کو

تباہیوں سے دوچار کیا تھا' اسلام لے آئے۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ان کا ایک حصہ ہند میں مغلوں کی صورت میں قابض ہوا تو ان ہی میں سے ایک معمولی جاگیردار عثمان نے خلافت عثمانیہ کی بنا ڈالی ع کہ جس کی تیغ ہیبت ناک سے سفاک ڈرتے تھے! اور جو اپنے عروج کے زمانے میں تین براعظموں پر محیط تھی۔

(۴) دوسرا زوال

مگر پھر ''ہر کمالے را زوالے'' کے عالمگیر اصول کا شکار ہو کر اسے بھی کچھ اپنوں کی سادگی اور کچھ غیروں کی عیاری نے تباہ و برباد کر دیا اور وہ قبائے خلافت کہ جس کے بغیر کوئی مسلمان جینے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا' تار تار ہو گئی۔ تقریباً سارا عالم اسلام یورپی استعمار کے زیر سایہ آ گیا اور بعد میں جب انہوں نے برائے نام آزادی حاصل کر بھی لی تو قبلہ یا تو واشنگٹن کو بنایا یا ماسکو کو اور صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی طرف توجہ نہ دی' لہٰذا یہ زوال تا حال جاری و ساری ہے۔

☆

اوپر کی بحث سے بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اصطلاح غلط ہے اور ہمیں نشاۃِ ثانیہ کی جگہ نشاۃِ ثالثہ کی اصطلاح استعمال کرنی چاہئے تھی' مگر دراصل یہاں جو عروج و زوال مراد ہے وہ عسکری نہیں بلکہ فکری ہے' یا بالفاظِ دیگر اُمت مسلمہ کی ہی نہیں بلکہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہے۔ اور جہاں تک اس کا تعلق ہے تو اس ضمن میں زوال کا آغاز خلافتِ عباسیہ کے دَور میں یا انیسویں صدی میں نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا آغاز تو خلافت راشدہ کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا جب آہستہ آہستہ اسلامی ریاست میں حکمران' علماء اور صوفیاء کی تثلیث قائم ہو گئی تھی۔ حکمرانوں نے تو قرآن سے کوئی ربط نہ رکھا سوائے اس کے کہ ضرورت پڑنے پر اس کے ذریعے جہاد کے وعظ دلوا کر سرحدوں میں توسیع کا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ علماء نے بھی اس سے فقہی مسائل دریافت کر کے

اسے پسِ پشت پھینک دیا اور ان کے نزدیک اس کی حیثیت کتاب الفقہ یا یکے از ادلہ اربعہ (چار میں سے ایک) سے زیادہ نہ رہی۔ رہا معاملہ صوفیاء کا تو انہوں نے یوں تو ہر آیت کے ظاہر میں ستر ستر باطن نکالنے کا دعویٰ کیا مگر عملاً باطن تو کیا ظاہر سے بھی دلچسپی نہ دکھائی اور قرآن کی اہمیت قرونِ اُولیٰ کے بعد ہی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ نتیجتاً توجہات ایمان سے ہٹ کر اسلام' یقین سے ہٹ کر شہادت اور باطن سے ہٹ کے ظاہر پر مرتکز ہو گئیں جس کی بدولت ایک فکری خلا سا پیدا ہو گیا جسے فلسفۂ یونان نے آ کر بھر دیا اور نقل سے تعلق توڑ کر عقل کے علَم بلند ہونے لگے' جس کی ابتداء جبریہ اور قدریہ کے باہم مباحث سے ہوئی تھی' اسے اشاعرہ اور معتزلہ کے باہم مناظروں نے منطقی نتیجے تک پہنچا دیا۔ آیاتِ محکمات کو چھوڑ کر آیاتِ متشابہات پر مورچے باندھ دیئے گئے اور ان پر ہونے والے مناظروں نے یہ حالت اختیار کر لی کہ بغداد کے بیچ چوراہوں میں علماء کے بڑے بڑے گروہ سوئی کی نوک پر (معاذ اللہ) فرشتے بٹھانے میں مصروف تھے کہ تاتاریوں نے ان کی روحوں کو ہی فرشتوں کے حوالے کر دیا۔ زوالِ علم و عرفان کی یہ داستان یوں تو بڑی طویل ہے مگر علامہ اقبال نے اسے ایک ہی شعر میں یوں سمو دیا ہے ۔

تمدن ' تصوف ' شریعت ' کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!

(۱) تمدن

وہ قوم جس کے بانی ﷺ کے جسم اطہر پر بان کی چٹائیوں کے نشان بنے ہوتے تھے' الحمراء کے محلوں کی تعمیر میں مصروف ہو گئی۔ محلات کی اونچائی بڑھتی چلی گئی جبکہ ایمان پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ مسجدوں کو بنانے میں نمازیوں سے زیادہ کاریگر لگ گئے۔ مدرسوں کی تعمیر خون علم کی جگہ اینٹ گارے سے ڈالی جانے لگی۔ بغداد کا شہر یورپ کے قریوں کا منظر تو پیش کرنے لگا مگر تاتاریوں کے آگے ڈھال بننے میں ناکام رہا۔ شعراء کو ملک الشعراء کا خطاب تو ضرور مل گیا مگر وہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے میں

ناکام رہے۔ شمشیروں کی جگہ شعروں' ڈھالوں کی جگہ ڈھولوں اور نیزوں کی جگہ باجوں نے لے لی۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل' طاؤس و رباب آخر!

(۲) تصوف

اس خیال سے تو اختلاف ممکن ہے کہ تصوف کی ابتداء ہی غلط اصولوں پر ہوئی تھی' تاہم اس امر میں اتفاق کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کی موجودہ حالت اسلام کے اصولوں سے سراسر متصادم ہے۔ کچھ کے نزدیک اس کی ابتداء تو درست تھی مگر پھر بعد میں ہندوستانی' ایرانی' عیسائی اور دیگر فلسفوں کی آمیزش سے یہ تالابِ اطہر بدبودار جوہڑ میں تبدیل ہوگیا جبکہ بعض کے نزدیک اس عمارت کی بنیاد ہی غلط نہج پر اٹھی تھی۔

بہرحال تصوف میں نظریۂ وحدت الوجود کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ میں اس نظریئے کے متعلق اپنے یا کسی اور کے خیالات کی جگہ اقبال کے تصورات کو نقل کرنا پسند کروں گا جو اگرچہ اس معاملے میں ہرگز کوئی اتھارٹی نہیں ہیں لیکن بہرحال ان کے بعض اشعار کو یہ طبقہ بڑے دھڑلے سے استعمال کرتا ہے اور عرس ہو یا میلہ ہر جگہ ان ہی کی غزلیں بصورت قوالی سننے کو ملتی ہیں۔ اقبال کے خیال میں جزو سے کل تک پہنچنے کا یہ وحدت الوجودی فلسفہ خالصتاً ہندوستانی ہے جسے سب سے پہلے ایک ہندوستانی مفکر سری شنکر نے پیش کیا تھا اور اس نقطۂ نظر سے گیتا کی تفسیر کی تھی۔ بعد میں مسلمانوں میں سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے اسی نقطۂ نظر سے قرآن کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور رفتہ رفتہ مسلم مفکرین بھی اسی رنگ میں رنگیں ہوتے گئے اور پھر شاعروں اور بالخصوص ایرانی شعراء نے اس کا پرچار کیا اور جزو سے کل تک کا درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے ''رگِ چراغ'' میں ''خونِ آفتاب'' کا اور ''شرارِ سنگ'' میں ''جلوۂ طور'' کا مشاہدہ کر ڈالا۔ علاوہ ازیں صوفیاء نے ہی مسلمانوں میں ''قدمِ ارواح'' اور ''مسئلہ تنزلاتِ ستہ'' کو متعارف کرایا۔ ان

میں سے قدم ارواح دراصل افلاطونی نظریہ ہے اور اسی کی وجہ سے امام غزالی نے بوعلی سینا اور ابونصر فارابی کی تکفیر کی تھی۔ شیخ ابن عربی نے اس فلسفے میں محض اتنی تبدیلی کی کہ اسے صالحین و کاملین کی ارواح کے ساتھ خاص کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ اصول وہی ہے اور اسی نظریئے نے مسلمانوں میں قبر پرستی کی بنا ڈالی۔ دوسری طرف ''تنزلات ستہ'' کا فلسفہ افلاطونیت جدیدہ کے بانی ''پلوٹائنیس'' کا تجویز کردہ ہے اور وحدت الوجود دراصل اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔

عربی لٹریچر تو ان زہروں سے بقول اقبال محفوظ ہی رہا تاہم فارسی لٹریچر کو اس نے بری طرح پراگندہ کر ڈالا جس کی سب سے نمایاں مثال حافظ شیراز کا کلام ہے جس کے اثر بد کے متعلق اکبرالہ آبادی جیسے صوفی شاعر کو بھی یہ کہنا پڑ گیا تھا۔

ان میں باقی ہے کہاں خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

چنانچہ اسی تصوف اور اسی صوفیانہ کلام کی بدولت عوام کے قویٰ مضمحل ہو گئے اور وہ بھی ظاہر پر باطن کو، شریعت پر طریقت کو اور ہوش پر سکر کو ترجیح دینے لگے۔ اور اس سب کا اثر ان کے اعمال پر کیا ہوا اس کا کچھ اندازہ تو اکبر کے درج بالا شعر سے ہی ہو جاتا ہے، مگر اسے مزید واضح کرنے کے لئے ایک اور مثال مناسب رہے گی۔ وحید خان ایک شاعر تھا جو کسی جوگی کا مرید ہو کر ویدانیت (ویدانیت، ہمہ اوست اور وحدت الوجود ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں) کا قائل ہو گیا۔ اس تبدیلیٔ خیال و عقیدہ نے اس پر جو اثر کیا اسے وہ خود بیان کرتا ہے۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دَل کے دَل دیں موڑ
چرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے مُنہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے پیر پکڑے ہیں، یا بالفاظِ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے، میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا، کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔

مزید برآں یہی فلسفہ کارفرما ہے رہبانیت کے پیچھے اور اس مقولے ''دنیا ہیچ است وکارِ دنیا ہمہ ہیچ'' کے پیچھے۔ یہ بھی اسلام کی فکری تعلیم کے متصادم ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ''ترک الاسباب جهالة والاعتماد عليها شرک ''یعنی ''اسبابِ دنیا کوترک کرنا جہالت ہے جبکہ ان پر اعتماد کرنا شرک ہے''۔

(۳) فقہ

فقہ کے متعلق بالعموم کہا جاتا ہے کہ یہ دورِ ملوکیت میں مدون ہوئی۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے' لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس کا مقصد تدوین ہی دراصل ملوکیت کا تحفظ تھا یا اس پر ملوکیت نے نہایت گہرے اثرات چھوڑے ہیں بڑی غیر منطقی زقند ہے جسے کوئی باشعور فرد سراہ نہیں سکتا۔ یہ قول دراصل مرعوبانہ ذہنیت کی پیداوار ہے اور اس کا مقصد یہی ہے کہ شریعت کو مغربی اصولوں کے تحت از سرِ نو مدون کیا جائے اور اس کے لئے اجتہاد کے لفظ کو یہ جانے بغیر کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے' نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پھر ایسے افراد جو یہ دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے خود تو شاید ہی کبھی فقہ کی کوئی کتاب دیکھی ہوتی ہے یا شاذ ہی انہیں اس علم سے کوئی خاص آگاہی ہوتی ہے' اِلا ماشاء اللہ' ان کا علم بالعموم سنی سنائی باتوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ دلائل کے طور پر چند ایسے بادشاہوں اور امیروں کے طرزِ عمل کو پیش کرتے ہیں جنہیں شریعت سے کوئی علاقہ نہ تھا یا پھر انتہائی دردناک مثالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اسلام کے معاشی نظام کو پوری طرح سمجھے بغیر سودی نظام کی حمایت میں چند فرضی بیواؤں' یتیموں اور بوڑھوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق تو یہی عرض کیا جاسکتا ہے ع

دعوائے بے دلیل قبولِ خرد نہیں!

مزید برآں اس بات میں ہرگز کوئی حرج نہیں کہ شریعت کی حکمتوں کو عقل وخرد کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جائے' بلکہ یہ انتہائی مفید کام ہے کہ اس طرح ان احکام کو بجا لانے والے کو بھی انشراحِ صدر حاصل ہوتا ہے اور مخالفین کے دلائل کا توڑ بھی اس سے

کیا جا سکتا ہے' مگر عقل کو معیار بنا کر شریعت کو اِس پر پرکھنا اور اس کے مطابق کانٹ چھانٹ کرنا دراصل شریعت خداوندی کو شریعت عقلی میں تبدیل کرنا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اقبال کو بھی کہنا پڑ گیا تھا۔

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں!

(۴) کلام

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی متکلم عضد الدین ایجی نے علم الکلام کی تعریف کچھ یوں کی تھی:

''علم الکلام وہ علم ہے جو عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لئے دلائل دینے اور شبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے''۔

مسلمانوں میں علم کلام کا آغاز دراصل بعض اعتقادات کی عقلی و منطقی توجیہہ و تشریح سے ہوا تھا' لیکن بعض افراد بیرونی اثرات مثلاً فلسفۂ یونان وغیرہ کے زیر اثر آ کر اسلامی عقائد کو عقل کی کسوٹی پر ناپتے ناپتے اتنی دُور نکل گئے کہ علمائے شریعت کو اُن کی تکفیر کرنی پڑی۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار آیاتِ متشابہات تھیں جن کی من مانی تاویل کر کے اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ قرآن میں اصل حیثیت آیاتِ محکمات کو حاصل ہے اور قرآن خود انہیں اُمّ الکتاب کا نام دیتا ہے' لہٰذا متشابہات کی ہر وہ تشریح جو محکمات اور صحیح احادیث کے خلاف ہو قابل قبول نہیں۔ ورنہ ہماری فکر میں کجی پیدا ہو جائے گی اور ہم ایک گرہ کو کھولنے کے بعد سو گرہوں کا شکار ہو جائیں گے اور حقیقت تک ہماری رسائی ناممکن ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے علمائے تفسیر نے حتی الوسع قرآن کے لفظی مطلب سے قریب ترین رہنے کی تلقین کی ہے لیکن بدقسمتی سے بعض ایسے افراد جو بزعم خود تجدید اسلام کا ارادہ لے کر نکلے تھے ان سے اسی غلطی کا ارتکاب ہوا کہ انہوں نے محکمات کے ذریعے متشابہات کی تشریح و توضیح کرنے کے بجائے متشابہات کے ذریعے محکمات کی تاویل کرنی شروع کر دی۔ اور پھر یہ تاویل بھی بالعموم

افکارِ اغیار سے متاثر ہو کر کی گئی اور اس کے ذریعے وہ نقل کو عقل کے ہر تقاضے کے سامنے سرنگوں کرتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر قرآن میں بعض جگہ جہنم کی آگ کا دلوں تک پہنچ جانے کا تذکرہ ہے تو یہاں دل کو روح کا استعارہ مان کر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ حساب اور جزا و سزا کا معاملہ اجساد کے ساتھ نہیں بلکہ ارواح کے ساتھ ہوگا اور پھر اسی کے ذیل میں ان تمام آیات جن میں یوم الدین اور جنت و دوزخ کا ذکر ہے' کی تاویل کر کے اسلام کو ایک فلسفیانہ مذہب میں تبدیل کر کے رکھ دیا گیا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

نوٹ : یہاں میں نے درج بالا چار علوم کے صرف منفی پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ چاروں علوم گندگی کا ڈھیر ہیں' بلکہ یہاں صرف ان قابل مذمت مساعی پر تنقید کرنا مقصود ہے جو ان علوم کو آڑ بنا کر کی گئی ہیں۔

☆

یہ تو تھیں چند ابتدائی باتیں۔ اب ہم تاریخی اعتبار سے اس فکری زوال کے عوامل اور ان کے ردعمل کے طور پر ابھرنے والی اہم شخصیات' تحاریک اور اس ضمن میں ہونے والے اہم واقعات کا تذکرہ کریں گے۔

قبل از غزالی دَور

مسلمانوں میں عقائد دینی کو عقلی معیار پر پرکھنے کا کام ذرا بعد میں شروع ہوا۔ ابتداء میں جو علم الٰہیات کی تشکیل ہوئی وہ دراصل بعض مابعد الطبیعیاتی مسائل پر آپس میں مباحث پر مبنی تھی اور اس میں اصل اہمیت عقل کے بجائے نقل کو ہی حاصل رہی' چنانچہ جبریہ ہو یا قدریہ' مرجئہ ہو یا وعیدیہ' انہوں نے جن موضوعات کو نشانۂ بحث بنایا دلیل کے طور پر نقل کو ہی پیش کیا اور عقل کو محض اس کی وضاحت و تشریح کے لئے استعمال کیا گیا۔ تاہم مسلم تاریخ میں معتزلہ غالباً وہ پہلا گروہ ہے جس نے نقل کو عقل کے معیار پر پرکھنے کی طرح ڈالی اور عقل و منطق کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی اور ان تصورات کو

جوان کے نقطۂ نظر کے مطابق منطقی تصویب کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے' نئے معانی پہنا کر عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا انہوں نے ملائکہ' جنت' دوزخ' پل صراط' میثاق' میزان' کوثر' معراج' معجزات' عذابِ قبر اور اس طرح کی دیگر اصطلاحات کو اِن کے معروف معنوں میں لینے سے انکار کیا۔ ان کی بنیادی بحثیں صفاتِ خداوندی سے ذاتِ خداوندی کا تعلق' رؤیت باری تعالیٰ' خلق قرآن کا مسئلہ' عدل الٰہی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حقیقت پر مشتمل تھیں۔ اس ضمن میں انہوں نے نقل سے بھی حوالے دیئے مگر بنیادی طور پر استدلال عقل وخرد سے ہی کیا۔ چونکہ انہیں ایک وقت میں حکومت وقت سے قرب بھی حاصل رہا لہٰذا انہوں نے اپنے مخالفین بالخصوص مسئلہ خلق قرآن میں اپنے نکتہ چینوں پر ظلم وتشدد کا بازار گرم کیا۔ اس ضمن میں جس ہستی کا نام سرفہرست ہے وہ امام احمد بن حنبلؒ ہیں جنہوں نے شدید ظلم سہہ کر بھی حق کا جھنڈا بلند ہی رکھا۔

معتزلہ کے ردعمل کے طور پر اشاعرہ ابھرے۔ اس گروہ کے بانی جناب ابوالحسن الاشعریؒ تھے جو شروع میں تو معتزلہ کے حامی تھے مگر بعد میں انہوں نے اعتزال سے توبہ کی اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ اشاعرہ کے مطابق عقل انسانی محدود ہے وہ تمام حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتی لہٰذا اصل حقیقت ایمان بالغیب کی ہے۔ اشاعرہ نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ لڑی۔ ایک طرف تو انہوں نے معتزلہ کے عقائد ونظریات کے معاملے میں قرآن وحدیث میں بیان کردہ عقیدوں کی مدافعت کی۔ دوسری طرف روایت پرستوں کے اس نقطۂ نظر کی بھی مخالفت کی کہ مذہبی معاملات میں عقل کو بالکل ہی استعمال نہ کیا جائے۔ ان کی امتیازی شان یہ ہے کہ انہوں نے نقل کو عقل پر ترجیح دی اور اسے عقل کی صحت کو ناپنے کا معیار قرار دیا۔ انہوں نے معتزلہ کے برخلاف درج ذیل نظریات پیش کئے:

۱) صفاتِ باری تعالیٰ نہ تو ذاتِ باری تعالیٰ کا حصہ ہیں نہ ہی اس سے جدا ہیں' بلکہ اس کا تعین کرنا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔

۲) قرآن مجید فرقان حمید غیر مخلوق اور قدیم ہے۔
۳) رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے۔
۴) آزادیٔ ارادہ دراصل شعورِ آزادیٔ ارادہ تک محدود ہے اور اخلاقی اعمال کے ماسوا باقی تمام اعمال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پیہم فعالیت کارفرما ہے۔

مسلمانوں کی ان باہم بحثوں کے دوران ہی ان پر فلسفۂ یونان کی یلغار شروع ہو گئی تھی۔ ۷۶۲ء میں پہلے عباسی خلیفہ المنصور نے بغداد کی بنیاد رکھی تو اس نے دُور دراز کے علاقوں سے علماء وحکماء کو اس شہر میں بلایا اور مختلف علوم وفنون کی کتب کا ترجمہ شروع کروایا۔ تاہم اس فکری بوچھاڑ کا بھرپور آغاز خلیفہ مامون الرشید کے دَور میں ہوا۔ کہا جاتا ہے (اور جیسا کہ ''الفہرست'' میں ہے) کہ مامون نے خواب میں ارسطو کا دیدار کیا اور وہ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے شاہِ روم سے (جاگنے کے بعد) دوستانہ تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے مراسلت کے ذریعے قدیم علوم کے ذخیروں اور نادر کتب کے نسخوں کا کچھ حصہ بغداد بھیجنے کی درخواست کی۔ روم میں پہلے ہی ۵۲۹ء سے ان علوم کی تحصیل پر کلیسا نے پابندیاں عائد کر رکھی تھیں اور قدیم کتب کی لائبریریوں کو تالے لگا دیئے گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بڑی خوشی سے اس بات کی اجازت دے دی۔ چنانچہ مامون نے بعض علماء کو بھیج کر کتب وغیرہ منگوالیں اور ۸۳۲ء میں بغداد میں ایک بیت الحکمت قائم کیا اور اس کے ساتھ ایک رصدگاہ' ایک لائبریری اور ایک دارالترجمہ بھی منسلک کیا۔ علم وفضل کا یہ مرکز تیسری صدی قبل مسیح میں بننے والی اسکندریہ یونیورسٹی کے بعد دنیا میں سب سے بڑا مرکز تھا۔ فلسفۂ یونان کی اس آمد سے مسلمانوں کا تقریباً ہر علم متاثر ہوا۔ تاہم تصوف اور علم الکلام اس ضمن میں سب سے زیادہ اثر پذیر ہوئے۔ مزید برآں اسی کے زیر اثر مسلمان مفکرین کا ایک اور گروہ بھی اٹھا جو عقلیت پسندوں پر مشتمل تھا جو کہ مسلم تاریخ میں فلاسفہ کہلانے کے اصل حق دار تھے۔ یہ سب کے سب فلاسفہ دیگر علوم مادیہ مثلاً سائنس کے بھی ماہر تھے۔ بلکہ اگر بدقتِ نظر دیکھا جائے تو فلسفے میں تو ان کا کردار بیشتر ترجمے کا اور اتباع کا ہی نظر آتا ہے'

تاہم انہوں نے سائنس کے میدانوں میں بیش قدر اضافہ کیا۔ ان میں سے قابل ذکر نام الکندی، فارابی، ابن سینا، ابن الہیثم، ابن مسکویہ وغیرہ کے ہیں۔

امام غزالیؒ

حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الطوسی الشافعی الغزالی ۱۰۵۸ء میں خراسان کے علاقہ طوس میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک غریب کسان کا بیٹا ہونے کے باوجود علم و فضل میں کمال پیدا کیا۔ تاہم پھر آپ بتدریج تشکیک کا شکار ہوتے چلے گئے اور انہی علوم کے بارے میں جن کے آپ معلم تھے، ریب میں مبتلا ہو گئے کہ کیا واقعی عقل و منطق سے مابعد الطبیعی تصورات کا ادراک ممکن ہے؟ گیارہ سال کی صحرانوردی کے بعد انہیں تصوف کے ذریعے یقین کا وہ سرمایہ نصیب ہوا جو فلسفیانہ اور دیگر علوم کا مطالعہ عطا نہ کر سکا تھا۔ آپ کا انتقال ۱۱۱۱ء میں ہوا۔

امام غزالیؒ نے مسلم فکر و فلسفہ پر سب سے گہرے اثرات چھوڑے۔ ان کا اصل کارنامہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''تہافتہ الفلاسفہ'' (فلاسفہ کا ابطال) ہے۔ دراصل آپ کے پیش نظر چار قسم کے گروہ تھے، متکلمین، صوفیاء، باطنیہ اور فلاسفہ۔ آپ نے ان چاروں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان سب پر مختلف کتابیں لکھیں اور ان سب کا محاکمہ کیا۔ لیکن سب سے زیادہ زور آپ نے فلاسفہ کے ابطال پر دیا۔ فلاسفہ کے نزدیک عقل کو نقل پر فوقیت حاصل تھی جبکہ آپ عقل کی نارسائی سے آگاہ تھے۔ آپ نے فلاسفہ کو ان کے خدا کے متعلق تصورات کی بنیاد پر تین حصوں میں تقسیم کیا۔

۱) دہریئے (Atheists) یا ملحدین جو خدا کے کسی بھی تصور کے منکر تھے اور کائنات کی ازلیت کے قائل تھے۔

۲) طبعیین یا الاہ پرست (Deists) جو ہستیٔ باری تعالیٰ کے تو قائل تھے مگر اس نظریئے کے پرچارک تھے کہ اس نظام ہست و کون کو ایک بار تو ''غیر متحرک محرک'' (un-moved mover) نے چلا دیا تھا مگر تب سے یہ علت و معلول کے لگے بندھے اصولوں کے تحت چل رہا ہے اور مشیت ایزدی کا اب اس میں کوئی

کردار نہیں۔

۳) الوہیت پرست (Theists) جو خدا کو کائنات کا خالق و مالک تسلیم کرتے تھے اور ساتھ ہی اس کے کائنات کے ساتھ مستقل تعلق کے قائل بھی تھے' لیکن مختلف منطقی الجھنوں کا شکار ہو کر ان کا فکر و فلسفہ تضادات کا شکار تھا' بالخصوص فارابی اور ابن سینا تو اپنے نظریات میں متعدد مغالطوں کا شکار تھے۔

امام غزالیؒ نے سب سے زیادہ تیسرے گروہ کو ہدف تنقید بنایا اور آپ نے سب سے پہلے ایک کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' کے عنوان کے تحت لکھی اور اس میں فلاسفہ کے مختلف نظریات مع دلائل بالصراحت درج کئے تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور پھر ''تہافۃ الفلاسفہ'' میں فلاسفہ کے بیس بنیادی نظریات کا انتخاب کر کے ان پر جرح کی اور پھر ان کی غلطی خود انہی کے منطقی اسلوب سے واضح کی۔ مزید برآں آپ نے مسلم فلاسفہ کے تین نظریات کو عقل و نقل دونوں کی روشنی میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور ان نظریات کے حاملین کی تکفیر کی۔ یہ نظریات درج ذیل ہیں:

۱) قیامت کے دن اجسام نہیں بلکہ صرف ارواح اٹھائی جائیں گی۔

۲) خدا کو جزئیات کا نہیں بلکہ صرف کلیات کا علم حاصل ہے۔

۳) یہ کارخانۂ عالم ازل سے ابد تک قائم رہے گا۔

تقریباً اسی دور میں امام ابن تیمیہؒ نے بھی لگ بھگ اسی موضوع پر ایک کتاب ''الرد علی المنطقیین'' کے نام سے لکھی۔ تاہم وہ اتنی اثر پذیری حاصل نہ کر سکی جو کہ امام غزالیؒ کی ''تہافۃ الفلاسفہ'' کو حاصل ہوئی اور نہ ہی وہ علمی حلقوں میں اتنی مقبولیت حاصل کر سکی جتنی کہ اتنی بڑی علمی شخصیت کی کتاب کو ملنی چاہئے تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کتاب امام ابن تیمیہؒ کے دیگر علمی کارناموں میں دب کر رہ گئی ہو اور پھر یہ بھی کہ وہ دور جس میں یہ کتاب لکھی گئی انتشار و بدامنی کا دور تھا۔

ابن طفیل اور ابن رشد

امام غزالیؒ کے اس گراں قدر کام کے بعد مسلمانوں بالخصوص عربوں میں فلسفیانہ

افکار ایک عرصے تک سر نہ اٹھا سکے اور فلسفہ ستر اسّی سال تک اپنے زخم سہلاتا رہا' یہاں تک کہ دو اندلسی فلاسفہ ابن طفیل اور ابن رشد جو آپس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی رکھتے تھے (ابن طفیل استاد اور ابن رشد شاگرد تھا) نے اسے سہارا دیا۔ یہ دونوں بھی اپنے ہم عصروں کی طرح فلاسفہ ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس دان بھی تھے' کیونکہ اس وقت تک سائنس اور فلسفے میں ثنویت قائم ہی نہ ہوئی تھی۔ بہرحال ابن طفیل نے بہت سی کتابیں لکھیں' تاہم آج تک صرف ایک ہی کتاب محفوظ رہ سکی ہے اور وہی عالمگیر شہرت کی حامل ہے۔ اس کا نام ہے ''حی ابن یقظان''۔ یہ ایک تمثیلی داستان ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان وحی کے بغیر بھی عقل و منطق اور وجدان کے ذریعے حقیقت مطلقہ کو پا سکتا ہے' اور اس طرح اس نے فلسفے کو کھڑا ہونے کے لئے زمین فراہم کی۔ پھر اس کے شاگرد ابن رشد نے اس کے کام کو مزید آگے بڑھایا۔ ابن طفیل تو عقل و منطق کے ساتھ ساتھ وجدان اور مذہبی تجربے کا بھی قائل تھا لیکن ابن رشد صرف اور صرف عقل و منطق کا قائل تھا۔ بہرحال ابن رشد کی اصل حیثیت تو ارسطو اور اس کی منطق کے مترجم اور شارح سے زائد نہیں ہے' تاہم اس کی اصل وجہ شہرت اس کی کتاب ''تہافۃ التہافۃ'' (ردّ کا ردّ) ہے جس میں اس نے امام غزالیؒ کی کتاب ''تہافۃ الفلاسفہ'' کا فلاسفہ کی جانب سے جواب دیا ہے۔ اس میں اس نے مسلمانوں میں فلسفے کی اہمیت کو پھر سے اجاگر کرنے اور امام غزالیؒ کے الزامات کا ردّ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا یہ ایک الگ بحث ہے' تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے اس ضمن میں مسلم فلاسفہ کا اعتماد ایک بار پھر بحال ضرور کیا۔

اس نے یوں تو اس کتاب میں ان تمام بیس باتوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جنہیں امام غزالیؒ نے اٹھایا ہے' تاہم اس نے خصوصی طور پر ان تین مسائل پر زور دیا ہے جن کی بنا پر امام غزالیؒ نے ابن سینا' فارابی اور دیگر کی تکفیر کی تھی۔ اس نے کہا کہ بے شک اللہ کائنات کے ایک ایک ذرے سے واقف ہے لیکن اس کا اندازِ علم ہم

سے مختلف ہے۔ اسی طرح کائنات کی ازلی حیثیت کے بارے میں اس نے کہا کہ کائنات بہرحال ثانوی حیثیت کی حامل ہے تاہم خدا کا کائنات پر تقدم منطقی طور پر ہے نہ کہ زمانی یا تاریخی طور پر۔ چونکہ زمان و مکان کا اطلاق صرف اس کائنات پر ہی ہوتا ہے اور خدا زمان و مکان کی وسعتوں سے بالاتر ہے لہٰذا یہ سوال مکمل طور پر غیر منطقی ہے کہ خدا سے پہلے کیا تھا؟ یا خدا کائنات سے پہلے تھا؟ مزید برآں حشر اجساد کے متعلق اس نے کہا کہ قرآن کی تاویل وتفسیر ایک خاص انداز سے کرنا بہرحال کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی بنا پر کسی کو کافر قرار دیا جا سکے۔

بغداد اور غرناطہ کے اجڑنے کے بعد مسلمانوں میں فکر کے سوتے بڑی حد تک خشک ہو گئے اور علم وفن کی وہ اہمیت پھر قائم نہ ہو سکی جو پہلے تھی' یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام کے بعد بھی توجہات دوسری اطراف میں ہی مرتکز رہیں۔ (جاری ہے)

مرکزی انجمن خدام القرآن کے شعبہ سمع و بصر کی تیار کردہ

دینی موضوعات کی ویڈیو سی ڈیز (VCD's)

☆ختم نبوتؐ اور تکمیل رسالتؐ	2 ویڈیو سی ڈیز
☆عظمت مصطفیٰ ﷺ	2 ویڈیو سی ڈیز
☆شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں ایک اصلاحی قدم	ایک ویڈیو سی ڈی
☆متاع الغرور (دنیا.....دھوکے کا سامان)	ایک ویڈیو سی ڈی
☆قائداعظم اور علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان	2 ویڈیو سی ڈیز
☆منتخب نصاب (جاری)	51 ویڈیو سی ڈیز
☆بیان القرآن (قرآن پاک کا مکمل ترجمہ و مختصر تشریح)	108 ویڈیو سی ڈیز

قیمت فی VCD: 40 روپے

ملنے کا پتہ: قرآن اکیڈمی' 36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 03-5869501

علامہ اقبال کی حجاز مقدس کے لئے تڑپ

حکیم راحت نسیم سوہدروی

علامہ اقبال عالم اسلام کی عظیم شخصیت تھے جنہوں نے ملتِ اسلامیہ کو بیدار کرنے کی بھرپور سعی کی تاکہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہو سکے۔ آپ سچے و پکے مسلمان اور سب سے بڑھ کر پکے موحد تھے۔ آپ کی رسول اکرم ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت مسلّمہ تھی۔ آپ خدا کو تسلیم کرنے کی بڑی دلیل ہی یہ قرار دیتے کہ رسول اکرم ﷺ نے خدا کے حی و قیوم ہونے کی تصدیق فرمائی۔

علامہ اقبال کی رسول اکرم ﷺ سے وابستگی کی کئی نسبتیں ہیں جن کا اظہار ان کی شاعری اور نثر میں جا بجا ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے باقاعدہ نعتیہ شاعری نہیں کی ہے تاہم جب بھی مدحتِ رسولؐ میں قلم اٹھایا تو اس میں خاص قسم کا رنگِ جذب و مستی پایا جاتا۔ ایک شعر میں رسول اکرم ﷺ کی ہمہ گیریت اس طرح بیان کی ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!

علامہ اقبال کے نزدیک عقیدتِ رسول اکرم ﷺ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی اسوۂ حسنہ کے مطابق گزارے اور رسول اکرم ﷺ جس مقصد کے لئے مبعوث ہوئے اس کی تکمیل میں زندگی وقف کر دے۔ علامہ اقبال کو رسول اکرم ﷺ سے عقیدت و عشق کی بنا پر ہی حجاز مقدس سے بے انتہا ارادت رہی۔ فرماتے ہیں۔

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری!
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری!

چنانچہ ان کی زندگی کی بڑی تڑپ اور خواہش حجاز مقدس کا دیدار رہی تاکہ مکہ و مدینہ کی زیارت اپنی آنکھوں سے کریں۔ عمر کے آخری حصے میں تو اس خواہش نے حسرت کی

صورت اختیار کر لی۔ ارمغانِ حجاز میں کئی رباعیات اس کی غماز ہیں۔

ایک بار حجازِ مقدس کے سفر کا پروگرام بنایا۔ اس حوالے سے مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''تقریباً علامہ سے ہر ملاقات میں ایک وقت پر حجاز کا ذکر چھڑتا تھا۔ آپ ان دنوں محض حجاز کا نہیں عالمِ اسلام کی سیاحت کا بھی عزم رکھتے تھے اور اپنے ہمراہ چوہدری محمد حسین اور مجھے (غلام رسول مہر) لے جانا چاہتے تھے۔ غزنی، کابل، سمرقند، بخارا، بلخ، شیراز، اصفہان، بغداد، کربلا، انگورہ، قسطنطنیہ، قاہرہ، فلسطین، مکّہ اور مدینہ کی خاص زیارت کے خواہاں تھے''۔

مولانا غلام رسول مہر کے مطابق اس دوران وہ اس سفر کے اخراجات اور دوسرے مسائل پر بھی تبادلہ خیال کرتے۔ ایک بار کہا کہ وہ جملہ امور پر غور و فکر کر کے بتائیں کہ کس طرح سفر باسہولت گزرے گا مگر کسی سبب سفر کا ارادہ ملتوی ہو گیا۔ مدینہ اور تاجدارِ مدینہ سے ان کی عقیدت کا ثبوت وہ خط ہے جو انگلستان جاتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں مولوی انشاء اللہ خان کو لکھا ہے۔ اس خط کا آخری حصہ اقبال کی حجاز مقدس سے والہانہ عقیدت سے مزین ہے، لکھتے ہیں:

''اب ساحل قریب آتا جاتا ہے، چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں؟ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں''۔

پھر جذبات سے بھرپور وارفتگی میں لکھتے ہیں:

''اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا فسوں پڑھ دیا کہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس بھیجا کہ پھل کا حصہ لے آؤ لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کر نکال باہر کیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پرواہ نہ کی۔ آہ! اے پاک سرزمین! تو وہ جگہ ہے جہاں مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ

مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرایا جائے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش دیکھے اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکار جسم کی خاک تیری ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش! میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی''۔

۱۹۳۰ء کے بعد علامہ کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی۔ وکالت کا کام چھوڑ دیا اور علاج معالجہ کی جانب توجہ ہوگئی۔ اس طرح غمِ دوراں اور غمِ جاناں مل کر دامن گیر ہو گئے مگر اس حالت میں حجازِ مقدس کی خواہش بڑھتی گئی۔ جب حجازِ مقدس کا تذکرہ ہوتا تو حالت غیر ہو جاتی اور رسول اکرم ﷺ کا اسمِ مبارک آتے ہی آبدیدہ ہو جاتے' طبیعت مشکل سے بحال ہوتی۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ کا اسم شریف زبان پر آتے ہی رنگ سرخ ہو جاتا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ مدحتِ رسولؐ کے جتنے بھی اشعار ہیں کوئی ایسا نہ ہوگا جسے آپ نے سنایا ہو اور اشک بار نہ ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا خوشی خوشی شعر سنانے لگتے' درمیان میں کوئی نعتیہ شعر آ جاتا تو رقت اور دل گرفتگی کا عالم طاری ہو جاتا' یہاں تک کہ باقی شعر ناشنیدہ ہی رہ جاتے''۔

سر اکبر حیدری کے نام ایک خط میں علامہ رقم طراز ہیں:

''تنہا خواہش جو میرے دل میں خلش کرتی ہے یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو تو حج کے لئے مکہ جاؤں اور وہاں سے اُس ہستی کے مزار پر حاضری دوں جس کا ذاتِ الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لئے وجہ تسکین اور سرچشمۂ الہام رہا ہے۔ میری جذباتی زندگی کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ یہ یقین مجھے پیغمبر اسلام کی زندگی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ہر بن مو آپؐ

کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری روح ایک بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آپؐ کے مزارِ مقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج ایک اظہارِ تشکر ہوگا''۔

۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو راستہ میں سکندریہ (مصر) رکے، جہاں مصر کے دیگر علماء وشخصیات کے ساتھ سید محمد قاضی ابوالعزام نے استقبال کیا اور پھر شام کو اپنے صاحب زادوں کے ساتھ علامہ کی قیام گاہ ہوٹل ملنے آئے۔ علامہ نے کہا: میں خود زیارت کے لئے حاضر ہو جاتا' آپ کیوں تشریف لائے؟ قاضی ابوالعزام نے کہا کہ خواجۂ دو جہاںؐ کا ارشاد ہے: جس نے دین سے تمسک کیا اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی' لہٰذا ارشادِ نبویؐ کے مطابق چلا آیا ہوں کہ میرے آقا خوش ہوں۔ علامہ نے سنا تو بے تاب ہو گئے اور انہیں ایک چپ سی لگ گئی۔ سید قاضی ابوالعزام نصیحتیں کرتے رہے اور علامہ سنتے رہے۔ جب وہ واپس ہوئے تو علامہ دیر تک روئے اور فرمایا: ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ مجھ ایسے گنہگار کو متمسک بالدین جان کر خواجۂ دو جہاںؐ کے ارشاد کی اتباع میں حضور ﷺ کی خوشنودی کے لئے ملنے آتے ہیں۔ اتنا کہہ کر پھر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔

اس سفر لندن سے واپسی پر موتمر عالمِ اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لئے بیت المقدس گئے۔ واپس تشریف لائے تو کسی نے سوال کیا کہ جناب فلسطین سے زیارتِ حرمین کے لئے جانا کیونکر مشکل تھا؟ جواب میں علامہ نے فرمایا: ''مدینہ کی زیارت کو جانا ایک قلبی معاملہ ہے۔ میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ دنیاوی کام کے لئے آنا اور حرمِ نبویؐ کی دید کی جرأت کرنا سوءِ ادب ہے۔ پھر کچھ مقامی دوستوں سے وعدہ تھا جب بھی ایسا ہوگا آپ کے ساتھ ہوگا۔ ان دونوں خیالوں نے مجھے روکے رکھے ورنہ کوئی امر مانع نہ تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ ضمناً دربارِ رسولؐ میں حاضر ہونا معیوب محسوس ہوتا تھا''۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں کس مقام پر تھے۔ ان کی والہانہ محبت اور عقیدت انہیں مکہ و مدینہ کی زیارت پر مجبور کرتی رہتی۔ ایک جگہ خود

فرماتے ہیں۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
آں خنک شہرے کہ آنجا دلبراست!

اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں کہ:

''دسمبر ۳۷ء میں میری علامہ سے ملاقات ہوئی' ان دنوں وہ اپنا اردو و فارسی کلام ترتیب دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا: موجودہ کتاب (ارمغانِ حجاز) کب تک مکمل ہوگی؟ فرماتے ہیں: اگلے سال مدینہ پہنچ کر۔ جنوری ۳۸ء میں دوبارہ ملاقات ہوئی تو تذکرۂ حج ہوا۔ فرمایا: میں دو سال سے ارادۂ حج کی حالت میں ہوں' عملاً موقع جب خدا مرحمت کرے' بلکہ میں نے تو وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر کے لئے ہیں''۔

سید نذیر نیازی علامہ کے قریبی ساتھی تھے۔ وہ اپنی یادداشت ۱۰ر جنوری ۳۸ء میں رقم طراز ہیں:

''سفر حج کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا: ایک طرح سے میں حج کے راستے میں ہوں' چاہتا ہوں کہ یہ راستہ جلد طے ہو۔ پھر دم لے کر فرماتے ہیں کہ راستہ طے ہو سکتا ہے مگر مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ اب جو کچھ کہتا ہوں وہیں کے لئے کہتا ہوں۔ پھر علامہ رک گئے اور فرمایا: ''آستانۂ قدس پر پہنچ کر کچھ عرض کروں گا''۔

وفات سے دس ماہ قبل مخدوم الملک سید میراں شاہ نے قصد حج کیا اور علامہ اقبال کو ہمراہ چلنے کی دعوت دی' جس پر جواب میں لکھا:

''حج بیت اللہ کی آرزو تو دو تین سال سے ہے' خدا ہر پہلو سے رحمت فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو اور اگر آپ رفیق راہ ہوں تو مزید برکت کا باعث ہے۔ آپ ایسے باہمت کے لئے یہ سفر قطعاً مشکل نہیں ہے۔ ہمت تو میری بھی بلند ہے مگر بدن ذرا عاجز اور ناتواں ہے۔ کیا عجب خدا توفیقِ ارزانی فرمائے اور آپ کی معیت میں سفر مرحمت فرمائے''۔

پھر جب علم ہوا کہ سید میراں شاہ حج کے لئے تیار ہیں تو دوسرے خط میں علامہ لکھتے ہیں:

''میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ روضۂ رسولؐ پر یاد بھی کیا جا سکوں تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرأت ہوئی ہے "الطالح لی" یعنی گنہگار میرے لئے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ اس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہیں کریں گے''۔

اہلیہ کے انتقال کے بعد بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی آن پڑی۔ دوسری طرف آنکھ کی بینائی متاثر ہوئی اور معالجین نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ صحت بھی گر رہی تھی مگر سفرِ حجاز مقدس کی آرزو اب حسرت بن گئی تھی۔ مختلف جہاز راں کمپنیوں سے رابطہ کرتے رہے۔ ایک روز گھر میں ذکرِ حج ہوا تو بہن نے کہا کہ آپ کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے ایسی صورت میں حج کا سفر کیسے ہوگا' آپریشن کے بعد جانا۔ آپ نے بڑے رقت آمیز لہجہ میں فرمایا: آخر اندھے بھی حج کر آتے ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندوی علامہ اقبال کے عشقِ سفرِ حجاز بارے لکھتے ہیں کہ:

''زندگی کے آخری ایام میں پیمانۂ صبر اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشکِ محبت چھلک پڑتے۔ وہ اپنے کمزور جسم کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر تو نہ ہو سکے لیکن اپنے مشتاق اور بے قرار دِل نیز اپنی قوتِ تخیل اور زورِ کلام کے بل پر آپ نے حجاز کی وجد آور فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور آخری وقت تک آپ کا ''طائرِ فکر'' اس نشیمن اور آستانے پر منڈلاتا رہا''۔

علامہ اقبال کی سفرِ حجاز کے لئے خواہش ہی نہیں بلکہ حسرت رہی جو حضور ﷺ سے دلی وابستگی کا مظہر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مدینہ جائیں اور وہیں پیوند خاک ہو جائیں۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ انتقال کر گئے اور ان کی سفرِ حجاز کی حسرت ادھوری رہ گئی۔ تاہم غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کو عقیدت و محبتِ مصطفیٰ ﷺ ہی زیارتِ حجاز کے لئے تڑپاتی رہی ـــــ اور علامہ اس حوالے سے ہمیں مولانا جامی سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔

فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ (۳)

ایک مطالعاتی جائزہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تحریروں سے اقتباسات

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

مصیبت عبادت کی پریشانی اور دبی ہوئی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے

چنانچہ ہر ایک مصیبت زدہ شخص کا عبادت کی خواہش کرنا مصیبت کا نتیجہ نہیں ہوتا' بلکہ مصیبت خود عبادت کی پریشانی اور دبی ہوئی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے' جو فطرتِ نفس کا ایک حصّہ اور ہمیشہ اپنی تسکین کے لئے کوشاں ہے۔ مصیبت کا باعث آرزوئے نفس کی فطرت ہے' جو ایک مکمل دائمی رفیق کے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتی اور جو عموماً اور فطرتاً عبادت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

مصیبت' زحمت کے بھیس میں رحمت ہے۔ اگر یہ اتنی شدید ہو کہ انسان کو اپنے نصب العین کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دے تو اس سے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے کھل جانی چاہئیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہم صرف مصیبت میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور صحیح نصب العین سے مسلسل تعلق قائم نہیں رکھتے۔ ہم غلط نصب العین اختیار کرنے پر تیار رہتے ہیں اور اپنے حقیقی اور واحد دوست کی پکار پر کان نہیں دھرتے۔ یہ ایک ناشکر گزاری ہے جو ہمارے سوا کسی اور کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے اور درحقیقت ہمیں اس کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے' اس لئے شعور کے ساتھ باہمی تعلق کو عبادت کی باقاعدہ عادات سے قائم رکھنا اور مسلسل بڑھاتے رہنا ضروری ہے۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے ہم اپنے آپ کو غلط نصب العینوں کی کشش سے محفوظ رکھ سکتے ہیں' جو ہمیں گمراہ کرنے اور تکلیف پہنچانے

کے لئے ہمیشہ گھات میں لگے رہتے ہیں۔ (ایضاً)

عبادت کا مسلسل تکرار فرد کے لئے عظیم انکشاف کا باعث ہونا

عبادت انسان کا اعلیٰ ترین اور گراں ترین تجربہ ہے۔ یہ شعورِ انسانی کا اپنے ماخذ شعورِ ایزدی سے وصال کا نام ہے۔ یہ نفس کا اپنی منزلِ مقصود کی طرف سفر ہے۔ یہ فرقت زدہ عشاق کی ملاقات ہے' وہ عشاق جنہوں نے ایک دوسرے کی طلب و جستجو میں بے حد مصائب کا سامنا کیا ہوتا ہے۔ عبادت کی عادت کو اگر قائم رکھا جائے تو یہ نفس کو جلد ہی ایک عظیم انکشاف کی طرف لے جاتی ہے۔ نفس ایک آسودگی' طمانیت اور سکون محسوس کرتا ہے۔ گویا کہ اسے جس شے کی تلاش تھی' حاصل ہوگئی ہے۔ یہ وصالِ عشاق آگے چل کر ایک دائمی اتحاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے' جسے روز افزوں محبت و اعتماد' زندگی اور تقویت ملتی ہے۔ عبادت کا ہر فعل بشرطیکہ وہ احساسِ محبت کا ایک موزوں اظہار کرے' حسن کے ایک نئے جلوے کو سامنے لاتا ہے اور احساسِ حسن میں مزید شدت و قوت پیدا کرتا ہے۔ محبت اسی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ یہ ایک زبردست نصب العین بن جاتی ہے اور فرد کی تمام زندگی پر چھا جاتی ہے۔ تمام پرانے نصب العین محض ذیلی خیالات بن کر رہ جاتے ہیں اور ان سے صحیح نصب العین کے رستے میں حائل ہونے کی تمام طاقت چھن جاتی ہے۔ یہ کام مشکل اور صبر آزما ہے' لیکن ہر انسانی کامیابی کے لئے شرط ہے۔ (ایضاً)

عبادت میں نفیٔ ذات کے پہلو کا مضمر ہونا

عبادت میں نفیٔ ذات کا ایک پہلو مضمر ہوتا ہے' جو درحقیقت محبوب کی موجودگی میں نفس کے نامکمل ہونے کے احساس اور اس لئے مکمل ہونے کی آرزو کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نفیٔ ذات محبوب تک پہنچنے کے لئے ایک کوشش ہوتی ہے اور اس لئے اس کا حال تصدیقِ ذات' قوت اور اعتماد ہوتا ہے۔ پُرخلوص ندامت کے سوا جو انتہائی عاجزی' جاں نثاری اور فنائے ذات کا پہلو لئے اور جس کی بدولت آنکھوں سے آنسوؤں کی

جھڑی لگ جائے نفس کو کوئی شے اس کا پہلا مقام نہیں بخش سکتی' کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے نفس ان خواہشات کو ترک کر سکتا ہے جو درحقیقت اس کی اپنی نہیں ہوتیں بلکہ اس کی فطرت کے مخالف ہوتی ہیں۔ غیر پسندیدہ نصب العینوں کی محبت سے جس میں کچھ عرصہ مبتلا ہو کر نفس نے نقصان اٹھایا ہوتا ہے' نفس کو پاک کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ نفس کے جذبۂ محبت کو صحیح نصب العین کے لئے فارغ کرنا ہوتا ہے۔ اشکوں کے اس وضو کے لئے بہترین وقت رات کا پچھلا پہر ہوتا ہے' جب خاموشی' سکوت اور دنیا و مافیہا سے مکمل علیحدگی توجہ وانہماک اور داخلی سعی کے لئے خاص طور پر مفید ہوتی ہے۔ (اسلامی تعلیم' مئی جون ۱۹۷۳ء' مضمون ''عبادت اور وجدان'')

حسن کے ہر تازہ علم کے ساتھ علم میں اضافہ ہونا

صحیح فطرت کے لئے بیگانہ نصب العینوں اور خواہشات کی محبت سے نفس جتنا زیادہ آزاد ہوگا اتنا ہی یہ اپنے نصب العین حسن کے زیادہ قریب پہنچ سکے گا۔ حسن کے ہر تازہ علم کے ساتھ نفس نہ صرف خود آزاد ہوتا جاتا ہے بلکہ اپنے علم میں بھی اضافہ کرتا چلا جاتا ہے' یہ زیادہ سے زیادہ خودشعور ہوتا جاتا ہے اور مادّی حجابات سے باہر نکلتا اور آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پاتا چلا جاتا ہے۔ علمِ نفس اور علمِ حسن طریقۂ ارتقاء کو لئے ہوئے ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں حتیٰ کہ خودشعوری ان انتہائی بلند منازل پر پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس مادی دنیا کے اندر رہتے ہوئے نفس کے لئے پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو انسانی شعور اپنے محبوب یعنی شعورِ ایزدی کے لئے ایک بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے' اور کچھ عرصہ تک تو اس طرح باہمی وصال محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی سوئی کسی مقناطیس سے' جب سوئی مقناطیس کے کافی قریب آ جائے تو وہ خود بخود سوئی کو اٹھا لے۔ جب تک نفس اس حالت میں رہتا ہے (اور یہ حالت بہت تھوڑی دیر تک قائم رہتی ہے) یہ اپنی آزادی سے غافل اور زمان و مکاں کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے'

کیونکہ اس وقت یہ زمان و مکاں کے خالق کے ساتھ مل کر ایک ہو چکا ہے۔ یہ تجربہ حیطۂ بیان سے باہر ہے۔ یہ نفس کے انتہائی ارتقاء اور مکمل آزادی کا پتہ دیتا ہے' یہ انسان کے دائرہ علم کی عظیم ترین' انتہائی وجدآور اور نہایت مسرور کن راحت ہے' جس کے سامنے ہر قسم کی لذتیں اور راحتیں ہیچ ہیں۔ اس قسم کی لیکن اس سے کمتر درجے کی بتدریج بڑھنے والی خوشی کا تجربہ ارتقاء پذیر نفس کو پہلے بھی ہو چکا ہوتا ہے اور اسی خوشی نے اسے مزید جدوجہد پر ابھارا ہوتا ہے اور اس کی ہمت بندھائی ہوتی ہے' اب اس کا نقطہ کمال آ پہنچتا ہے۔ یہ خوشی اس قدر مسحور کن ہوتی ہے کہ بعض دفعہ عاشق اس عالم کیف سے واپس نہیں آنا چاہتا۔ لیکن یہ جسارت محبوب کے سامنے گستاخی اور نافرمانی ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن چھن جاتا ہے' نفس مادی دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے' کیونکہ وہ اس تعلق کو قائم رکھنا نہیں چاہتا۔ یہ سزا اس کی اپنی اختیار کردہ ہوتی ہے۔

شدتِ محبت کی وجہ سے عاشق صادق کے احساسات

ایک سچا عاشق نہ صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا صحیح مقام ایک عبد (خادم) کا ہے بلکہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ محبت کی انتہائی نتیجہ خیزی صرف عبادت (خدمت) ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ساری ہستی کے ساتھ' جس میں اس کے قوائے عمل بھی شامل ہوتے ہیں' اپنا سر تسلیم محبوب کے سامنے خم کر دیتا ہے۔ وہ اس کے حضور میں اس نقطۂ نگاہ سے حاضر نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو فنا کر دے' بلکہ اس لئے حاضر ہوتا ہے کہ اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرے' اپنے آپ کا جائزہ لے اور عمل کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے اس پر تو تیار ہو جائے گا کہ محبوب سے دُور رہے' لیکن اس بات کے لئے تیار نہیں ہوگا کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ چنانچہ جب ارتقاء کا نقطۂ عروج آ جاتا ہے تو وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ محبوب کی آغوش میں چلا گیا ہے' بلکہ یہ کہ محبوب اس کی آغوش میں آ گیا ہے۔ اس کے لئے آخری تجربہ فنائے ذات نہیں' بلکہ تصدیقِ ذات ہے اور

اسی سے نفس کی کامل آزادی برقرار رہ سکتی ہے۔ اپنی ترقی کے انتہائی مقام پر بھی وہ اس قسم کا احساس رکھ سکتا ہے کیونکہ وہ نہایت احتیاط سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ احساس اس کے اس جذبۂ خدمت و عمل کی وجہ سے ہے جو اس کی خودشعوری کی ترقی کے دوران میں، جو بلاشبہ نہایت بتدریج ہوئی تھی، غیر متغیر اور غیر متزلزل بن گیا تھا۔ اس نے اپنی اس ریاضت و بندگی کو کبھی مبدائے لذت نہیں سمجھا۔ یہ تو محض ایک ضمنی فائدہ ہے، بلکہ اسے قوتِ اعمال کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ یہی اس کی حقیقی خواہش و آرزو تھی۔ اس کا اصل مبدائے لذت خدمت و عمل تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی روز افزوں قوت سے رضائے محبوب حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہا تھا۔ لہٰذا اس کی تمام تر توجہ اس لذت کی طرف مبذول رہتی ہے جو اسے محض صحبت سے حاصل ہوئی تھی۔ اس کے لئے عمل خود صحبت محبوب تھا۔ جب ایسا عاشقِ صادق ارتقائے نفس کے نقطۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کبھی تغافل نفس کی حالت میں نہیں ہوتا، بلکہ اس پر مکمل خودشعوری کی حالت طاری ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے خالق کی محبت میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ گویا وہ خود خالق ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتا، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ احساس غلط ہے اور محض شدت محبت کا نتیجہ ہے۔ اگر لوہے کا ایک ٹکڑا دیر تک آگ میں رکھا رہے تو وہ اتنا گرم اور سرخ ہو جاتا ہے کہ اسے آگ سے متمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح شدت محبت کے اوقات میں عاشق نفس اگرچہ اپنے آپ کو خالق کا مماثل قرار نہیں دیتا، لیکن اس کے باوجود وہ خالق سے اپنے آپ کو الگ سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسے اوقات طویل نہیں ہوتے۔ عاشق ایک جاں نثار خادم کی طرح اپنی اصل حالت پر واپس آنا چاہتا ہے اور اس لئے جلد ہی لوٹ آتا ہے۔ اس صورت میں نفس اپنے علم کے سمندر میں گہرا غوطہ لگاتا ہے اور جب ابھر کر سطح سمندر پر آ جاتا ہے تو فوراً اپنا اس طرح حاصل کردہ علم اسی مقصد یعنی خدمت محبوب کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ حسن و قوت کے نشے سے سرشار ہو کر اس میں ایک متحرک اور فعال زندگی بسر کرنے کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر تمام دنیا حیران رہ جاتی

ہے۔(ماہانہ اسلامی تعلیم جنوری، فروری، مضمون بعنوان ''تکمیل انسانیت'')

عاشق صادق کی بے نظیر راحت و مسرت کا راستہ

عاشق صادق رضائے محبوب کو خدمت سے حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے، یعنی اس کے نزدیک محبوب تک رسائی کی کوشش کرتے رہنا واقعی اور بالآخر رسائی سے زیادہ راحت بخش ہے۔ عملاً رسائی کے احساس کا مطلب مزید رسائی اور مزید ترقی کا خاتمہ ہے، حالانکہ عاشق کی ترقی اور رسائی کی انتہائی نہیں۔ اس کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب تک پہنچے بغیر اس کی جستجو جاری رہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اسے عملاً رسائی حاصل ہوگئی تو اس کی مسرت میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس لئے اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ محبوب سے دُور رہا جائے تاکہ وہ اس بے نظیر راحت و مسرت سے ہمکنار رہے جو محبوب تک رسائی حاصل کرنے اور اس کی رضا جوئی کی جدوجہد میں مضمر ہے..... وہ الگ رہنا چاہتا ہے، تاکہ خدمت و عمل کے نو بہ نو مواقع کی بدولت اپنی حاجات پر قابو پا کر رسائی کی کوشش ہمیشہ جاری رکھ سکے اور جب تک دنیا اپنے منتہائے کمال کو نہیں پہنچ جاتی یا جب تک دوسرے نقوش انتہائی خود شعوری کا مقام حاصل نہیں کر لیتے، ایسے مواقع کی کبھی کمی رونما نہیں ہوگی۔ (ماہانہ اسلامی تعلیم، جنوری، فروری ۱۹۷۳ء۔ مضمون بعنوان تکمیل انسانیت)۔

ایک عضویہ میں زندہ خلیہ دو حیثیتیں رکھتا ہے، اوّلاً یہ اپنی حد تک ایک مکمل فرد اور ایک عضویہ ہے اور اسے اپنی صحت و بقا کی خاطر کام کرنا چاہئے۔ ثانیاً یہ ایک ایسے کُل کا جزو ہے جو عضویہ کُل ہے۔ اس کی صحت اور عضویہ کی صحت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر یہ اپنی حد تک کافی صحت مند رہے تو یہ عضویہ کو بھی صحت بخشتا ہے اور اس طرح خود بھی صحت مند بنتا ہے۔ جب تک عضویہ کُل صحت مند نہ ہو، یہ جزو مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہر نفس انسانی کی دو حیثیتیں ہیں۔ یہ اپنی ذات کی حد تک مکمل فرد بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کُل کا جزو بھی ہے، جو آخر کار تمام انسانی معاشرے کا کُل ہے۔ چنانچہ کوئی نفس انسانی انفرادی طور پر منتہائے کمال کو نہیں پہنچ سکتا، بلکہ اس مقام پر صرف اسی کُل کے

ذریعے سے پہنچ سکتا ہے جس کا یہ ایک جزو ہے۔ چنانچہ عاشقِ شیدا اپنے ذاتی کمالات پر مطمئن نہیں ہو جاتا ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے آپ سے غیر مطمئن رہتا ہے جب تک وہ اپنی تمام تر محبت وسعی کے مطابق نسلِ انسانی کے کُل ارتقاء میں مدد نہیں کرتا۔

عاشق صادق کا دنیا میں خالق کے نائب کی حیثیت سے کردار

باقی ماندہ انسانیت کے ارتقاء کے لئے ہر کوشش جو وہ کرتا ہے' اسے اپنے داعیۂ شعور کو تھوڑا سا اور مطمئن کرنے اور انفرادی حیثیت سے خود شعوری کو مزید ترقی دینے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہ طریق کار لامتناہی عرصہ تک جاری رہ سکتا ہے۔ شعورِ انسانی کا داعیہ محض یہ نہیں کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے' بلکہ اس کا داعیہ تمام انسانیت کو کمال تک پہنچانا ہے' کیونکہ شعورِ انسانی کا داعیہ وہی ہے جو شعورِ ایزدی کا ہے' ظہور یا عرفانِ ایزدی کسی فردِ واحد میں کمال یا منتہا حاصل نہیں کر سکتا۔ فردِ واحد نہیں بلکہ انسانی معاشرہ بحیثیت کل ہی خالق بن سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سچا عاشق اس دنیا کو اپنے عمل سے اس طرح بدلتا ہے جس سے یہ اس کے محبوب اور اس کے اپنے مشترکہ مقصد کے لئے بیش از بیش موزوں بن سکے۔ اس کا عمل اس کے محبوب یعنی خالق کے عمل کی طرح تخلیقی ہے۔ وہ زمین پر خالق کے نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ ایسا انسان ہی خالق کا حقیقی وصال حاصل کر سکتا ہے' کیونکہ وہ اس طرح عمل کرتا ہے جس طرح خود خالق دنیا میں پیکرِ انسانی اختیار کر لینے کی صورت میں کرتا ... یہ خالق کا مقصد ہی ہے جو کسی شخصیت میں صورت پذیر ہوتا ہے اور دنیا میں سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ ہم حضرت موسیٰؑ' بدھ' کرشن' حضرت عیسیٰؑ یا حضرت محمد ﷺ کی صورت میں کسی ایسی ہی شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا شخص ایک مصلح کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے' وہ جانتا ہے کہ اصلاح کی کس جگہ ضرورت ہے۔ وہ ایک مبلغ کی شکل میں جہالت سے جنگ کر رہا ہوتا ہے' یا ایک شہید کی شکل میں حق کی فتح کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے' یا ایک جرنیل کی شکل میں امن وانصاف کے لئے معرکہ آراء اور ظلم وعداوت کے خلاف شمشیر

بکف ہوتا ہے یا بالعموم ایک معمولی دنیا دار انسان کی شکل میں مذکورہ بالا اَبطال سے کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ دوسرے انسانوں کے سامنے مشکلات میں صبر و عزیمت کے راستے پر چل کر ایک عمدہ مثال قائم کرتا ہے۔ لیکن ایسے اَبطال کو جو خالق کائنات کی محبت سے حرارت حاصل کرتے ہیں' ان مشاہیر سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے جو غلط نصب العینوں کی محبت و خدمت میں اپنی شخصیت کی نمود کرتے ہیں' کیونکہ ایسے لوگوں کی قربانیاں صرف نصب العین کے لئے ہوتی ہیں اور انسانیت کے لئے یہ بلا واسطہ مفید اشیاء کے مترادف ہوتی ہیں۔ (ایضاً)

عاشق کا سب کے لئے مہربان اور فیاض ہونا اور خوف سے بری ہونا

محبت فرد کی تمام زندگی کو بدل دیتی ہے۔ عاشق اپنے آپ کو حقیقی اور نا قابل فنا سمجھتا ہے' اس کا سینہ اُمید' ہمت اور اعتماد سے معمور ہوتا ہے اور وہ دنیا میں امن' سکون اور اطمینان سے رہتا ہے۔ صرف اسی میں ایک بلند شخصیت یا صحیح طور پر اچھا کردار مل سکتا ہے۔ وہ صفات خالق کے رنگ میں گہرا رنگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے رنگ' نسل اور قوم کی تمیز کے بغیر مہربان اور فیاض ہوتا ہے۔ وہ صادق القول' ایماندار' بہادر' رحم دل' مضبوط' آزاد' خوددار' شائستہ' ملنسار' عالی ہمت اور بردبار ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خوف جو تمام برائیوں کی جڑ ہے' اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ خوف کا کیا سبب ہے؟ ہم اس لئے خوف کھاتے ہیں کہ مبادا ہم جو کچھ چاہتے ہیں' حاصل نہ کر سکیں۔ جب ہم پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو ہم جھوٹ' مکر فریب' مصلحت' دغا' کینہ' خوشامد' چوری' قتل' بزدلی اور ظلم پر اتر آتے ہیں۔ عاشق کو صرف رضائے محبوب چاہئے' اس لئے اسے کسی سے خوف کی ضرورت نہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی دنیا کی اچھی چیزوں سے اچھے طور پر متمتع ہونا چاہتا ہے' یعنی ایسے ذرائع سے جو رضائے محبوب کے مطابق ہوں' ورنہ انہیں سرے سے حاصل ہی نہیں کرتا۔ صرف وہی جانتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اسے اعتماد ہوتا ہے کہ کوششوں میں کمی کے بغیر وہ

اس شے کو حاصل کرتا رہے گا جو رضائے محبوب کے مطابق ہے اور جس سے زیادہ اسے کوئی شے مطلوب نہیں۔ محبوب کی رضا اس کی اپنی رضا ہوتی ہے' چنانچہ اسے کسی شے سے خوف نہیں ہوتا' سوائے خود خوف اور اس کی انجام کار برائیوں سے۔ اس کی محبت رضائے محبوب ہے اور یہ شے اسے ہر دوسری محبت سے نجات دے دیتی ہے۔ یہی صحیح معنوں میں آزادیٔ نفس ہے اور صرف یہی کردار کو پاکیزہ بنا سکتی ہے اور فرد کی شخصیت کو ترفع سے آشنا کر سکتی ہے۔ (ایضاً)

ذکر سے حاصل ہونے والی قوت کو محبوب کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا

اگر مؤمن درحقیقت سچا مؤمن ہے تو ذکر اور تسبیح اور عبادت سے جو قوت اسے حاصل ہوتی ہے وہ اسے مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر ضائع نہیں کرتا' بلکہ دنیا کو اپنے محبوب کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے کام میں لاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی تسبیح بیان نہیں کرتی۔ اگر انسان ذکر و تسبیح پر ہی اکتفا کرے تو اس کا درجہ جمادات اور نباتات سے بلند نہیں ہوگا' جو بے شعور ہیں یا نیم شعور' لیکن انسان چونکہ خود شناس اور خود شعور ہے' کائنات میں اس کا اصل کردار یہ ہے کہ وہ کائنات کی تعمیر اور تکمیل میں خدا کا شریک کار بنے اور اس غرض کے لئے فقط زبان سے نہیں' بلکہ اپنی مسلسل عملی جدوجہد سے نعرۂ تکبیر بلند کرے۔ زبان سے ذکر اور تسبیح کرنا اس کردار کی تیاری کے ذرائع ہیں' کیونکہ ان سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اس کردار کو مؤثر طریق پر انجام دینے کے لئے کام آتی ہے۔ افسوس کہ اکثر علماء دین ذکر اور تسبیح پر زور دیتے ہیں' لیکن خدا کی مرضی کے مطابق دنیا کو بدلنے پر زور نہیں دیتے' حالانکہ قرآن حکیم کے ارشادات کی رو سے خدا مؤمنین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی دنیا کو اس کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے جدوجہد کریں اور ان سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو اس کی مدد ان کے ساتھ ہوگی۔ (اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہیں نصرت دے گا) خدا کی مدد یہی ہے کہ خدا کائنات کو ترقی دے کر جس کمال پر

پہنچانا چاہتا ہے' اس کا چاہنے والا مردِ مؤمن بھی یہ کوشش کرے کہ کائنات اس کمال پر پہنچے۔ (حکمتِ اقبال' صفحہ ۲۵۹' ۲۶۰)

خدا کی محبت کے بلند ترین مقام پر پہنچنا اپنے نفس کے ساتھ جنگ کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ انسان کا دل جنگاہ حق و باطل ہے' جس میں اگر حق فتح یاب ہو جائے اور انسان حق پرست بن کر خدا کے عشق کو کمال پر پہنچائے اور خودی میں ڈوب جائے تو اس کا نتیجہ نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ انسان کا خودی میں ڈوبنا یا خدا کی محبت میں جذب ہونا گویا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوبنا ہے۔ جب مؤمن اس ڈوبنے کے بعد ابھرتا ہے تو تیغ بے نیام ہو کر باہر آتا ہے اور پھر جس طرح سے اس نے اپنے دل کی جنگاہ حق و باطل میں باطل کا استیصال کر کے حق کو فتح یاب کیا تھا اور خدا کی مخلصانہ محبت کا نقش اپنے دل پر ثبت کیا تھا' اسی طرح سے وہ خارجی دنیا کی رزم گاہِ حق و باطل میں باطل کا استیصال کر کے حق کو فتح یاب کرتا ہے اور خدا کی مخلصانہ محبت کا نقش دنیا پر ثبت کرتا ہے۔ اس طرح سے اس کے وجود کی تیغ بے نیام خدا کی تقدیر کے مقاصد کو پورا کرتی ہے۔

نقش حق اول بجاں انداختن
باز او را در جہاں انداختن

ہر مسلمان کو چاہئے کہ اس کیفیت کو اپنے آپ پر وارد کر کے دیکھے کہ آیا وہ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے دلیر اور نڈر ہوتا ہے یا نہیں اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے تقدیر کے مقاصد کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا
(حکمت اقبال' صفحہ ۳۱۹' ۳۲۰)

حقیقت سے واقفیت کے لئے مشاہدۂ حق کے مقام کا حاصل ہونا ضروری ہے

مشاہدۂ حق کے اس مقام پر مؤمن کو ایک علم دیا جاتا ہے' جس سے دین کے رموز

واسرار اس پر آشکار ہوتے ہیں اور وہ حقائق دینی کا ذاتی احساس کرتا ہے' لہٰذا اس مقام پر وہ احکامِ شریعت اور اصول واخلاق کی پابندی مجبوری سے نہیں' بلکہ ایک ایسی رغبت اور خواہش سے کرتا ہے جس کا روکنا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اسے قرآن کے مطالب سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی' کیونکہ وہ اصل علوم جو اس کی فطرت میں ودیعت کئے گئے تھے' اس پر عیاں ہو جاتے ہیں اور جب وہ اپنی فطرت کے علوم کو جو اب اس کے لئے ایک زندہ اور متکلم علوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہوتے ہیں' اس قرآن سے جو کتاب کی صورت میں اس کے سامنے ہوتا ہے' مقابلہ کر کے دیکھتا ہے تو دونوں کو ایک دوسرے کے عین مطابق پاتا ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (العنکبوت: ٤٩)

''بلکہ یہ قرآن واضح آیات پر مشتمل ہے' جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جو علم رکھتے ہیں''۔

قرآن کی اصطلاح میں علم سے دینی حقائق کی ایسی واقفیت مراد نہیں جو درس و تدریس' تفسیر اور عربی زبان کی لغت اور گرامر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے' بلکہ حقیقت کا وہ ذاتی مشاہدہ' تجربہ یا احساس ہے' جس کی بنا پر ایک انسان خدا اور اس کے فرشتوں کی طرح اپنے ذاتی علم سے قرآن کی صداقت کی گواہی دے سکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کا علم رکھتے ہیں ان کے لئے قرآن نے **اولوا العلم**' **الراسخون فی العلم**' **الذین اوتوا العلم** اور علماء کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

قرآن کے داخلی علم کے بغیر قرآن کو خارجی ذرائع سے سمجھنے کی کوششیں' خواہ ان میں لغت کی موشگافیوں اور گرامر اور منطق کی باریک بینیوں سے کتنا ہی کام لیا جائے' کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرتیں' بلکہ مضر ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسلام میں فرقوں کے اختلافات ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ مطالب قرآن کا اندرونی علم ایسا ہے جیسے دن کے وقت راستہ پر چلنا اور اس کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے لئے ذہنی کاوش سے

کام لینا ایسا ہے جیسے تاریکی میں راستہ ٹٹولنا۔ جو لوگ قرآن کا داخلی علم حاصل کر لیتے ہیں ان کو قرآن کے مضامین و مطالب از بر ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس علم کے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ مغز ماری کے باوجود اس کے مطالب پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ (پاکستان کا مستقبل: صفحہ ۴۱، ۴۲، تصنیف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

خودی کا ارتقاء رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور آپؐ سے تعلق جوڑے بغیر ممکن نہیں

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نورِ محبت یا علم سے بہرہ ور ہوں تو ہمیں چاہئے کہ ہم کچھ عرصہ کے لئے عقل بہانہ جو کی کشمکش کو موقوف کر کے رسول اللہ ﷺ کی ذات پر اس طرح سے انحصار کریں جس طرح سے ایک جنین اپنی نشو و نما کے لئے ماں کے جسم پر پورا پورا انحصار کرتا ہے۔ پھر رسول کی پیہم اطاعت کی وجہ سے ہماری خودی کے ارتقاء کا ایک ایسا دَور بھی آئے گا جب دین کے اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ہم نیک و بد کا ذاتی امتیاز کرنے لگ جائیں گے۔ ارتقائے خودی کے اس مرحلہ پر ہمیں اعتقاد اور عمل میں رسول ﷺ کے ساتھ ایسی مشابہت حاصل ہوگی جو بیٹے کو شکل وصورت میں اپنے باپ سے ہوتی ہے' کیونکہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی روحانی ابنیت کا فخر حاصل ہوگا۔ قرآن میں بارہا آل (اولاد) کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو ایک آقا سے جذباتی اثر یا کسی نصب العین کی محبت قبول کرتے ہیں۔

جس طرح حرارت ایک بلند درجہ رکھنے والے جسم سے گزر کر کم درجۂ حرارت رکھنے والے اجسام میں' جو اس سے چھوتے ہوں' سرایت کرتی ہے یا جس طرح پانی ایک بلند سطح سے بہہ کر ان مقامات کو سیراب کرتا ہے جو اس کے آس پاس نیچے کی سطح پر واقع ہوں' اسی طرح سے زندگی کی لہر اس مقام سے گزر کر جہاں وہ سب سے بلندی پر ہوتی ہے' نوعِ انسانی کو مستفید کرتی ہے۔ خودی کا نور پہلے ایک مقام پر فراہم ہوتا ہے اور پھر وہیں سے اردگرد میں پھیلتا ہے۔ خاتم النبیین ﷺ کی ذات عالم انسانی میں خودی کا بلند ترین مقام ہے' جہاں زندگی کا پانی فراہم ہوا ہے' تاکہ نوعِ انسانی کی فطرت کی پیاس کو

بجھائے۔ اگر ہم زندگی کے پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے سرچشمہ یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ ایک گہرا دلی تعلق قائم کریں، ورنہ ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (پاکستان کا مستقبل، صفحہ ۸۷)

رسمی اطاعت اور شدید محبت کے زیر اثر اطاعت کے درمیان فرق

ان تصریحات سے اگر یہ پتہ چلتا ہے کہ خودی کا ارتقاء رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اطاعت جو ایک شدید محبت یا قلبی تعلق کا نتیجہ نہ ہو اور محض ایک رسم یا عادت کی صورت میں رہ گئی ہو وہ ارتقائے خودی کے لئے مفید نہیں۔ کیونکہ دراصل وہ اطاعت ہی نہیں، بلکہ پابندیٔ رسم یا زورِ عادت کا ظہور ہے۔ بظاہر رسمی یا عادی اطاعت محبت والی اطاعت سے مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن درحقیقت پہلی قسم کی اطاعت ضعف عقائد کا نتیجہ ہے اور پھل کے ایک چھلکے کی طرح ہے، جو بظاہر پھل نظر آتا ہے لیکن مغز سے خالی ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اطاعت بھی جسمانی تکلیف کے بغیر نہیں ہوتی، تاہم انسان کی خودی کی تربیت نہیں کرتی اور اسے روحانی ترقی کی منزلوں پر آگے نہیں لے جاتی، بلکہ کولہو کے بیل کی طرح وہیں کا وہیں رکھتی ہے۔ دوسری قسم کی اطاعت پختگی عقائد سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا منبع ایک اندرونی جذب یا کشش ہوتا ہے اور وہ ایک بے ساختہ قدرتی عمل کی صورت اختیار کرتی ہے اس لئے اس میں مؤمن کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نوافل کی صورت میں رفتہ رفتہ اپنا پھل لاتی ہے۔ یعنی مؤمن کی محبت میں اضافہ کر کے اسے نوافل پر مائل کرتی ہے اور وہ خود بخود نوافل میں اضافہ کرتا جاتا ہے اور ان میں ایک دلی رغبت محسوس کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے فرائض سے کم ضروری نظر نہیں آتے۔

جن عبادات کو نوافل کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فالتو اور غیر ضروری نہیں، جیسا کہ ہم میں سے بعض کا خیال ہے، وہ حد درجہ ضروری ہونے کے باوجود نوافل اسی لئے ہیں کہ ان پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ فرائض کی مخلصانہ ادائیگی سے جو مقامات

مؤمن کی خودی کو یقینی طور پر حاصل ہوتے جاتے ہیں ان مقامات پر وہ ایک زبردست اندرونی کشش کے ساتھ ان نوافل کی طرف زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ مائل ہوتا جاتا ہے اور اس طرح سے اپنی ترقی کا سامان خودبخود پیدا کرتا جاتا ہے' یہاں تک کہ بنیادی احکام یا فرائض کے اندر جو انتہائی مقاصد مخفی ہیں' ان کو خودبخود پا لیتا ہے۔ شارع علیہ السلام نے مؤمن کی آزادانہ ریاضت اور عبادت کے لئے بہت سا میدان چھوڑ دیا ہے' کیونکہ خودی کی آزادانہ اختیاری جدوجہد اس کی انتہائی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ پس مخلصانہ اطاعت سے انسان کی خودی اپنے ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتی جاتی ہے' یہاں تک کہ انتہائی منزل پر جا پہنچتی ہے۔ جہاں اسے کہا جاتا ہے:

﴿یٰاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ﴿ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ﴿ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ﴿﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰)

''اے روحِ مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف چل۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے بندوں میں شامل ہو اور میری بہشت میں داخل ہو جا''۔ (ایضاً صفحہ ۸۹)

قدرت کے مقاصد کے لئے عدم استعمال کی وجہ سے گرائے جانے کا خطرہ

خواہ ہم اسلام سے کتنے ہی روگرداں ہوں اور خواہ یہ بات ہمیں اس وقت کیسی ہی مشکل نظر آئے' لیکن اسلام پھر بھی اس دور کے غلط نظریات پر جو اسے برباد کر دینے پر تلے ہوئے ہیں' غالب ہو کر زندہ رہے گا۔ البتہ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہم سازگار حالات کے باوجود جو قدرت ہمارے لئے پیدا کر رہی ہے' قدرت کے ارادوں کے ساتھ تعاون کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں ہم مقاصدِ ارتقاء کے لئے بیکار بلکہ مضر سمجھ کر نظروں سے گرا دیئے جائیں گے۔ سلطنت کی نعمت ہم سے چھین لی جائے گی اور ہمیں ذلت کی زندگی بسر کرنے اور آخرکار مٹ جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا اور ہماری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیا جائے گا' جو اسلام کی خدمت کرنے اور لوگوں کی ملامت سے بے پرواہ ہو کر زمانہ کے باطل کے ساتھ ٹکر لینے کے

لئے تیار ہو گی' پھر سلطنت' دولت' علم اور دنیا کی تمام نعمتیں اسی قوم کو دے دی جائیں گی۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محض میرے تخیل کی پیداوار نہیں' بلکہ قرآنِ حکیم کی متعدد آیات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (المائدۃ: ۵۴)

''مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین سے منحرف ہو جائے تو خدا کو اس کی پرواہ نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے' مسلمانوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت ہوں گے' خدا کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کا باک نہ رکھیں گے''۔

﴿اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ﴾ (محمد: ۳۸)

''اگر تم اسلام سے منحرف ہو جاؤ تو خدا تمہیں مٹا کر تمہارے عوض میں اور قوم لائے گا' پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے''۔ (ایضاً صفحہ ۹۵)

اسلام کے کامل نظریئے کو اختیار کرنے والی ریاست کا مستقبل

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان ایک کمزور اور چھوٹا سا ملک ہے' جو بالخصوص ایٹم بم کے اس زمانہ میں دنیا کی بڑی طاقتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا' لیکن قوموں کا عروج و زوال نہ تو اُن کے ظاہری مادی اسباب پر منحصر ہے اور نہ ان کی قوت سعی و عمل پر' بلکہ اس کا دارومدار کائنات کی باطنی قوتوں کے عمل پر ہے۔ جو قوم بھی ان قوتوں کے نہ رکنے والے عمل کو اپنے موافق اور مطابق کرے گی وہ زندہ رہے گی اور دوسری قومیں خواہ ان نظریات کے ظاہری اسباب کچھ ہوں' مٹ کر فطرت کی اس چہیتی قوم کے لئے راستہ صاف کر دیں گی۔ جس طرح سے ایک فرد کی خودی کے اندر جذبۂ حسن و کمال موجود ہے' اسی طرح سے کائنات کی ساری ارتقائی حرکت اس جذبہ کے اظہار و اطمینان کے لئے ہے۔ اور قدرت نے انسان میں جو جذبۂ حسن و جمال رکھا ہے وہ بھی

اسی غرض سے ہے کہ انسان اس کے ساتھ مل کر کام کرے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ جو قوم کائنات کے اندرونی جذبۂ حسن و کمال کی مؤید ہوگی' دوسرے الفاظ میں جو قوم آخر کار کامل نظامِ تصورات کو اپنی زندگی کی حقیقی بنیاد بنائے گی وہ روئے زمین پر حکومت کرے گی' کیونکہ اس کے ظاہری حالات خواہ کیسے ہی مایوس کن ہوں فطرت اسے عروج و کمال پر پہنچانے کے لئے بے تاب ہے۔ اگر وہ تہی دست و نادار ہو گی تو دولت دوسروں سے چھین کر اسے دے دی جائے گی۔ اگر اس کے پاس سامانِ جنگ نہ ہوگا تو اسے اجازت دے دی جائے گی کہ دوسروں کا سامانِ جنگ چھین کر اپنے قبضہ میں لے لے۔ اگر وہ بے علم و بے ہنر ہوگی تو اسے علم و ہنر سے آراستہ کیا جائے گا۔ اگر وہ عمل سے محروم ہوگی تو دوسروں کے ہاتھ پاؤں شل کئے جائیں گے اور اسے قوتِ سعی و عمل سے نوازا جائے گا۔ قدرت ان تمام ترقیوں سے جو وہ نوعِ انسانی کو آج تک نصیب کرتی رہی ہے' صرف ایک قوم کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اور وہ خاتم النبیین ﷺ کی اُمت ہے۔ اگرچہ اس قوم کی تعمیر کے سامان کا بہت سا حصّہ اس وقت دوسری قوموں میں بکھرا ہوا ہے' لیکن بالآخر وہ یکجا کر کے اسی قوم کے سپرد کیا جائے گا۔ مسلمان مطمئن رہیں کہ جو کچھ دنیا پیدا کر چکی ہے وہ ان ہی کا ہے اور جو کچھ دنیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا' وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی الواقع ایک کامل نظامِ تصورات کی حیثیت سے کام میں لائیں' یعنی اپنی سیاسی زندگی کی روحِ رواں بنائیں۔ (پاکستان کا مستقبل' صفحہ ۹۹)

قوموں کا ایک دوسرے کے ساتھ تصورات کی جنگ میں مبتلا ہونا

اسلام اور اسلامی تصورات کی تبلیغ کا مسئلہ خود ہمارے لئے اس دنیا میں بھی زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر' بلکہ اس میں ڈھیل اور سستی کرنے سے بھی ہم ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم دوسری قوموں کو مغلوب نہیں کریں گے تو یقینی بات ہے کہ ہم خود ذہنی طور پر اُن سے مغلوب ہو جائیں گے اور ذہنی غلامی ہمیشہ سیاسی غلامی کا پیش خیمہ ہے۔

اس زمانہ میں قومیں اپنے نظریاتِ زندگی کی بنا پر متحد ہو رہی ہیں۔ ہر قوم چاہتی ہے کہ اپنے نظریۂ زندگی کو ماننے والے افراد یا اقوام کی تعداد میں اضافہ کر کے اپنے آپ کو اور طاقتور بنائے۔ اس غرض کے لئے وہ پروپیگنڈا کے تمام جائز یا ناجائز ذرائع کو کام میں لاتی ہے۔ جس حد تک کوئی قوم کسی دوسری قوم کے نصب العین کے اثرات کو قبول کرتی ہے اس حد تک وہ خود کمزور ہو جاتی ہے اور اس کی حریف قوم طاقتور ہو جاتی ہے' اگرچہ وہ قوم اپنی کمزوری یا حریف قوم کی طاقت کا فوری احساس نہ کرے۔ ہر قوم دوسری قوم کی دشمن ہے اور اس کی قوت کو سلب کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرنا چاہتی ہے' لہٰذا اس کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف رہتی ہے۔ قومیں توپ و تفنگ کے ساتھ تو شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے مقابلہ پر آتی ہیں' لیکن تصورات کے آلات کے ساتھ وہ ہر آن اور ہر لحہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں اور تصورات کے حملے توپ و تفنگ کے حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ (اسلام کا نظریۂ تعلیم' صفحہ ۳۶۔ تصنیف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

قوموں پر ذہنی محاذ کی شکست کے اثرات

جب ایک قوم ذہنی محاذ پر شکست کھا جاتی ہے تو خواہ اس کی فوجی طاقت کیسی ہی زبردست ہو' وہ فوجی محاذ پر لڑنے کے قابل نہیں رہتی' بلکہ خود بخود ہتھیار ڈال کر دشمن کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی قوم ذہنی محاذ پر اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ تھوڑی فوج کے ساتھ دشمن کی فوج کو شکست دے لیتی ہے۔ اور اگر دشمن اسے فوجی لحاظ سے مغلوب بھی کرے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنی محاذ فوجی محاذ کے مقابلہ میں کس قدر زیادہ اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دشمن پر حملہ کرنے میں پہل کرنا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ اصول جس قدر فوجی محاذ کی صورت میں درست ہے اسی قدر ہی ذہنی محاذ کی صورت میں بھی درست ہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمارے دشمن مدت سے ہمارے خلاف اپنے تصورات کے حملہ کو شروع کر چکے

ہیں۔ اگر ہم اس حملہ کا مؤثر جواب نہ دیں تو ہماری زندگی خطرہ میں رہے گی۔ اپنی قوم کو دوسری قوموں کے غلط تصورات کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فوراً دوسری قوموں کے خلاف علمی اور عقلی تصورات کے پُر امن آلات کے ساتھ جارحانہ کارروائی کا آغاز کریں اور جب تک ہمیں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو جائے اسے متواتر جاری رکھیں' ورنہ ان کے تصورات کا اثر ہمارے اعتقاد اور یقین کو سلب کرتا چلا جائے گا اور ہم ذہنی اور سیاسی لحاظ سے کلیۃً مغلوب ہو جائیں گے۔

ذہنی کارزار میں فی الفور اپنی پوری قوت کے ساتھ اترنے میں پیش قدمی نہ کرنے کا سبب یا تو ہماری لاعلمی ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ ہم پر کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے اور ہمیں اپنی محافظت اور مدافعت کی ضرورت ہے' اور یا پھر ہم اس حملہ کے ممکن نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو اس قدر مضبوط اور مستحکم سمجھتے ہیں کہ کسی مدافعت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس وقت ہماری قوم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں وہ غیر اسلامی نظریات کے اثر کا نتیجہ ہیں۔ اشتراکیت' قومیت پرستی' نسل پرستی اور صوبہ پرستی کے امراض جس حد تک ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہو گئے ہیں' کیونکہ اب تک اس محبت کی رَو کو تازہ بتازہ جسد ملت کے ہر ایک حصہ تک پہنچاتے رہنے کے لئے ہمارے پاس کوئی نظامِ تعلیم موجود نہیں تھا اور جس حد تک ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہوئے ہیں اسی حد تک غیر اسلامی تصورات کی محبت ہمارے دل میں متمکن ہو گئی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۷' ۳۸)

قوموں کی جیت اور ہار کا اصل میدان

اگر ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک اسلامی نظامِ تعلیم کی تعمیر میں دیر کی تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔ کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اس کی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے' اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دارومدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور

اقتصادی قوت تعمیر پاتی ہے۔ اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو جائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے۔ جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جو جیت جائے اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنا دی جاتی ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم اس دوڑ میں جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں۔ ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے۔ جو قوم وقت ضائع کرے گی' خواہ وہ کیسی ہی طاقتور ہو' ضرور ہار جائے گی۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات اور معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلا جائے گا' اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہیں گے' بلکہ ہمارے اعتقادات و تصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لے گا۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں' بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ (اسلام کا نظریۂ تعلیم' صفحہ ۳۸'۳۹)

کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں' بلکہ بعض وقت چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے' لیکن اس کے باوجود یقینی طور پر نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہو رہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد' دنیا ضرور اُس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی قوم مر رہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اس کی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا کچھ عرصہ کے بعد' اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آ جائے گی۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم مر رہے ہیں یا زندہ ہو رہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں' یا ہم اپنے اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی

آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے ان کی سیاست پر غالب آ جائیں گے۔ موت اور زندگی' غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیان دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی مقام نہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہمارا رُخ کس طرف ہے' ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف' زندگی کی طرف یا موت کی طرف؟ اب بھی ہم اپنے نظامِ تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بنا سکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دلخراش اور اندوہناک ہے۔

آزادی وغلامی اور شکست وفتح کا اصل فلسفہ

کسی قوم کا امتیازی نشان جو اُسے دوسری قوموں سے الگ ایک قوم بناتا ہے اور اس کی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے' وہ اس کا اعتقاد یا اس کا تصورِ حیات ہی ہوتا ہے۔ غلامی اصل میں ذہنی غلامی ہے اور آزادی ذہنی آزادی۔ جو قوم سیاسی غلامی کے باوجود اپنے نظریۂ زندگی پر قائم رہ سکتی ہے اور اسے فی الواقع اپنے فکر وعمل کا مدار ومحور بنا سکتی ہے' وہ درحقیقت آزاد ہے۔ اس کے برعکس سیاسی آزادی کے ہوتے ہوئے جس قوم کے فکر وعمل کی بنیاد غیروں کے معتقدات پر ہو' وہ آزادی کے باوجود غلام ہے۔ سیاسی آزادی کسی قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہوتی' بلکہ ہر قوم سیاسی آزادی کو اپنی ذہنی آزادی کی خاطر حاصل کرتی ہے۔

اسی طرح سے ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے۔ کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی جب تک اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہوگا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہوگا۔ لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۰)

(جاری ہے)

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : تذکرۂ تابعین

مصنف : عبدالرحمٰن رافت پاشا

مترجم : ارشادالرحمٰن

ضخامت : 338 صفحات

قیمت : 130 روپے

ملنے کا پتہ : منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب تابعین کے حالات پر مشتمل ہے۔ تابعی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابیؓ کو حالتِ ایمان میں دیکھا ہو۔ اصحابِ رسولؐ کے بعد یہ لوگ اُمت میں افضل ترین ہیں۔ ان لوگوں نے اصحاب رسولؐ سے فیض حاصل کیا اور وہ چہرے دیکھے جنہوں نے محبوبِ خدا ﷺ کا مبارک چہرہ دیکھا اور آپؐ کے دہنِ مقدس سے نکلے ہوئے الفاظ کو اپنے کانوں سے سنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((طُوبٰی لِمَنْ رَانِیْ وَاٰمَنَ بِیْ وَطُوْبٰی لِمَنْ رَاٰی مَنْ رَانِیْ))

''خوشخبری ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اور خوشخبری ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھنے والے کو دیکھا''۔

تابعین کی تعداد تو لاکھوں سے متجاوز ہے اور وہ سبھی فضیلت مآب تھے، تاہم

مصنف نے اس کتاب میں ۲۹ جلیل القدر تابعین کا تذکرہ پیش کیا ہے۔

مسلم سجاد اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''یہ کتاب تابعین کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ عبدالرحمٰن رافت پاشا کے منظر کشی کے انداز نے ان تذکروں میں زندگی کی رو دوڑا دی ہے۔ پڑھتے ہوئے قاری منظر سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ زمان و مکان کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ پھر تاثیر کا کیا پوچھنا''۔

مترجم نے ترجمہ کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ منظر کشی کا جو انداز مصنف نے اختیار کیا اسی کو مترجم نے نہایت قابلیت اور مہارت کے ساتھ قائم رکھا۔ اندازِ تحریر اتنا رواں اور فطری ہے کہ اگر بتایا نہ جائے تو کوئی پڑھنے والا یہ نہیں جان سکتا کہ یہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا ہوا ہے۔ تحریر میں منجھے ہوئے ادیب کا طرز نمایاں ہے۔ کتاب ٹھوس مواد پر مبنی ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جو نہ صرف اس کتاب کے مآخذ کی نشان دہی کرتی ہے بلکہ تابعین کے حالات کے سلسلہ میں مزید مطالعہ کرنے والوں کی راہنمائی بھی کرتی ہے۔

اس تذکرے میں سب سے پہلی شخصیت جس کا ذکر کیا گیا ہے، وہ جلیل القدر تابعی عطاء بن ابی رباحؒ ہیں جو بادشاہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں موجود تھے۔ عطاء بن ابی رباح بوڑھے حبشی تھے جنہیں جسے مسجدِ حرام کے مفتی کا منصب حاصل تھا۔ بادشاہ خود چل کر ان کے پاس جاتا اور ادب کے ساتھ کھڑا رہتا۔ اس تذکرے کی آخری شخصیت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ ہیں، فقہی مسائل میں جن کے مقام و مرتبہ سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ممتاز تابعین کے تذکروں میں حسن بصری، قاضی شریح، سعید بن مسیّب، عمر بن عبدالعزیز، زین العابدین، سالم بن عبداللہ اور نجاشی شاہِ حبشہ (رحمۃ اللہ علیہم) شامل ہیں۔

کتاب نہ صرف معلومات افزا ہے بلکہ کردار سازی میں بھی انتہائی مفید و مؤثر ثابت ہو سکتی ہے، کیونکہ صاحبِ فضیلت لوگوں کے حالات پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے ان کی صحبت میں بیٹھنا۔ اس طرح یہ کتاب گھر میں موجود ہو تو چھوٹے بڑے سبھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۲)

نام کتاب : To Regain Paradise Lost

مصنف : اشفاق الرحمٰن خان

ضخامت : 196 صفحات

قیمت : 100 روپے

ملنے کا پتہ : 51/2 ڈی بلاک' ماڈل ٹاؤن' لاہور

اشفاق الرحمٰن خان عمر رسیدہ' تجربہ کار' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پختہ ایمان و یقین کے مالک مسلمان ہیں۔ اپنے نحیف و نزار جسم میں وہ مضبوط و توانا دل رکھتے ہیں جو انسانی ہمدردی سے مملو ہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں اسلامی اخلاق و کردار کی نشان دہی کی گئی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب صاف ستھری' سادہ اور آسان انگریزی میں ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ تعارفی ہے جس کے علاوہ تین حصے اور ہیں۔ تعارفی حصے میں اسلام کے بارے میں کچھ غیر مسلموں کے تاثرات بیان کئے گئے ہیں جن میں اسلام کی متوازن' فطری اور سہل تعلیمات کی تعریف کی گئی ہے۔ مزید برآں چند نومسلموں کے بیانات بھی قلمبند کئے گئے ہیں جن میں انہوں نے قبولِ اسلام کے پر تاثیر واقعات لکھ کر اسلام کی حقانیت کا اعتراف کیا ہے۔

تعارفی حصے کے بعد پہلے حصے میں عقیدۂ توحید' مقصدِ تخلیقِ کائنات' قرآن مجید کی اہمیت' رسول اللہ ﷺ کی اطاعت جیسے موضوعات کو عنوان بنایا ہے۔ دوسرے حصے میں ارکانِ اسلام کی بحث میں نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج کے احکام قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کئے ہیں جبکہ آخری حصے میں باہمی حقوق و فرائض کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

کتاب صحیح اسلامی تعلیمات کا مرقع ہے جس کی بنیاد اسلام کے دو سرچشموں یعنی

کتاب وسنت پر رکھی گئی ہے۔ انگریزی سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان بچوں کے لئے یہ کتاب ایک اضافی ریڈر کے طور پر بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس طرح عام مسلمان بھی اپنے بچوں کو اگر یہ کتاب پڑھا دیں تو نہ صرف انہیں بنیادی اسلامی تعلیمات کا شعور حاصل ہو جائے گا بلکہ ان کی انگریزی بھی بہتر ہو جائے گی۔

(۳)

نام مجلّہ : ریسرچ جرنل (بابت ستمبر ۲۰۰۲ء)

مدیر (اردو سیکشن) : ڈاکٹر دوست محمد

مدیر (انگلش سیکشن) : ڈاکٹر شازیہ بابر

ادارہ : شیخ زاید اسلامک سنٹر یونیورسٹی آف پشاور (پاکستان)

قیمت : 100 روپے + ڈاک خرچ 50 روپے

شیخ زاید اسلامک سنٹر کے ریسرچ جرنل کا یہ شمارہ علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ایک معیاری مجلّہ ہے۔ اس کے مضامین سنجیدہ، وقیع اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ تمام تحریریں معروف اہل علم وقلم دانشوروں کے فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ ریسرچ جرنل کی مجلس مشاورت ممتاز علمی اور ادبی شخصیات پر مشتمل ہے۔

زیر تبصرہ شمارہ میں چار آرٹیکل انگریزی میں اور چار ہی اردو میں ہیں۔ اردو حصہ ۵۲ صفحات پر جبکہ انگریزی حصہ ۱۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ ممتاز علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کی مطبوعات میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ ریسرچ جرنل کے ٹائٹل پر شیخ زاید اسلامک سنٹر کی پُرشکوہ اور خوبصورت عمارت کی تصویر ہے جس کے اوپر ادارے کا مونوگرام بنا ہوا ہے۔

ریسرچ جرنل کی تیاری میں مضبوط سفید کاغذ استعمال کیا گیا ہے جبکہ جلد کارڈ بورڈ کی ہے۔ لکھائی اور چھپائی معیاری ہے البتہ کمپوزنگ کی غلطیاں کہیں کہیں موجود ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

❁ حیات و سیرتِ اقبال ❁ فلسفہ اقبال
❁ ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

❁ اقبال اور قرآن ' از قلم: سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے
اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000